عید مبارک
ایڈونچر نمبر
بچوں کا خوبصورت میگزین روایت اور جدت ایک ساتھ
ماہنامہ
لاہور
الف نگر
ALIF NAGAR
مئی، جون 2022
SHAHEEN
شاہین
نامور مصنفہ عمیرہ احمد کے قلم سے بچوں کا پہلا سلسلہ وار جاسوسی ناول

New Arrival

Rs 600

+ Delivery Charges

To Order contact

0321 8460220

بچوں کا خوبصورت نگر جہاں روایت اور جدت ایک ساتھ

ماہنامہ الف نگر لاہور

ALIF NAGAR

جلد:05 مئی،جون 2022 شمارہ:02-01

چیف کانٹینٹ آفیسر	عمیرہ احمد
ایڈیٹر	عائشہ اطہر
سب ایڈیٹر	آمنہ ارشد
معاون	حسن عمر
آرٹ منیجر	ثمین توقیر
گرافک ڈیزائنگ	محمد عباس حسین
کمپوزنگ	ثاقب سلطان
ایڈورٹائزنگ / مارکیٹنگ / سرکولیشن	روحیل آفتاب 0321 846 0220
قاصد	شہروز تصور

الف نامہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ!!

پیارے بچو!

آپ سب کو رمضان کے مبارک مہینے کی نعمتیں سمیٹنے کے بعد عید کی بہت ساری خوشیاں مبارک اور ان ہی خوشیوں میں ایک خوشی الف نگر کی چوتھی سالگرہ کی بھی ہے جو آپ اور ہم اس شمارے کے ساتھ عید پر مل کر منا رہے ہیں۔

عید پر عیدی تو بنتی ہے تو یہ عیدی ہم آپ کو شاہین کی پہلی قسط کی صورت میں دے رہے ہیں۔ ''شاہین'' کا موضوع کیا ہے؟ کردار کون کون سے ہیں؟ ہم آپ کو کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔ یہ تو آپ اسے پڑھنے کے بعد ہمیں بتائیں گے کہ آپ کو ''شاہین'' کی دُنیا کیسی لگی اور کیا آپ اس کی ہر قسط کے ساتھ پرواز کرنا چاہیں گے؟ کیونکہ شاہین تو ہمیشہ اُونچی اُڑان بھرتا ہے۔

یہ شمارہ ایڈونچر نمبر بھی ہے تو بس دل تھام کر بیٹھ جائیں کیونکہ اس کی ہر کہانی آپ کو نت نئے تجربوں اور جہانوں میں لے جانے والی ہے، جہاں آپ کبھی کسی جذبے کی داد دیں گے اور کبھی کسی کی ہمت کو سراہیں گے کہیں کسی کی جرأت آپ کا خون گرمائے گی تو کہیں کسی کی دلیری آپ کے رونگٹے کھڑے کر دے گی، لیکن ہم آپ کو یہ یقین ضرور دلاتے ہیں کہ ایڈونچر نمبر آپ کو چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔

مئی کا مہینہ یوم مئی پر محنت کشوں کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے، اور محنت میں عظمت ہے یہ صرف محاورہ نہیں ہے ہمارے دین کی تعلیمات کا حصّہ بھی ہے۔ ہم سب پر لازم ہے کہ ہم نا صرف مئی کی پہلی تاریخ کو بلکہ ہمیشہ اپنے آس پاس موجود ان سارے مزدوروں کو سراہیں جو کبھی کھیتوں کھلیانوں میں کام کر کے ہمارے رزق کا سامان پیدا کرتے ہیں اور کہیں وہ فیکٹریوں میں کام کر کے ہماری آسائشوں کے لئے اپنا خون پسینہ بہاتے ہیں، کہیں گھریلو کاموں میں مددگار کی شکل میں ہماری زندگیاں آسان بناتے نظر آتے ہیں۔

تو بس اس عید پر ہم نا صرف ان مزدوروں کو یاد رکھیں گے بلکہ ان مستحقین کی مدد بھی کریں گے جو عید پر خوشیاں منانے کے لئے ہماری مدد کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

ایک بار پھر آپ کو الف نگر کی ٹیم کی طرف سے ڈھیروں مبارکباد۔

والسلام

(ادارہ)

خط و کتابت کے لیے: ماہنامہ الف نگر B-1، وائٹ ہاؤس لین 2، سندر داس روڈ، لاہور۔ فون نمبر: 042-36300351 | 0306-6665360

فیس بک: alifnagarofficial یوٹیوب: alifnagarofficial ای میل: submissions.alifnagar@alifkitab.com

قیمت فی شمارہ: -/150 روپے | سالانہ (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک): -/1000 روپے زیرِ اہتمام: الف کتاب پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مئی، جون 2022

03	حمد	ارسلان اللہ خان
04	نعت	محمد اویس بلوچ
05	سزا	روبنسن سموئیل گل
08	طوطے کے گیت	مدیحہ شاہد
10	کوہ پیما کا ایڈونچر	فضہ شکیل
12	دن عید کا (نظم)	رمضان شاکر
13	شاہین ''برگد کی چڑیلیں''	عمیرہ احمد
17	اُڑن طشتری کا تجربہ	محمد احمد رضا انصاری
20	کالا جال سرخ مکڑا	قرۃ العین خرم ہاشمی
23	گلو اور سلو بھائی کی مہم جوئی	روبینہ کبیر خان
26	جنگجو اور اژدھا	احمد عدنان طارق
28	طلسماتی جزیرہ	عائشہ اطہر
32	اچھی باتیں (نظم)	نظیرہ فاطمہ
33	رنگ ماسٹر	احمد نعمان شیخ
37	برف کا پہاڑ	احسان اللہ نیر شوکت
40	سیدھا راستہ	الطاف حسین
44	روشن چہرے	قیصر مشتاق
46	خوفناک تجربہ	سیدہ اقرار اعجاز
48	شیف ثانی	حاجرہ ارشد
49	ساشا اور کوکو کا ایڈونچر	فرزین لہرا
52	کیڑا اغوا کار	تحریم جمیل
56	چچا خواہ مخواہ اور حکومیاں	عائشہ اطہر
58	آ رے تن کی تتلی	حنیف ملک
60	ناقابل فراموش ایڈونچر	ناہید گل
62	قاتل کون؟	رخشندہ بیگ
65	چچا خیراتی اور چالاک نائن	حسن اختر
67	مختصر کہانیاں	
71	پٹاخے	حسن عمر
72	میل ملاقات	

حمد

ارسلان اللہ خان

میرا اللہ کتنا پیارا ہے
جس نے سارا جہاں سنوارا ہے

اس کی نعمت کا کچھ جواب نہیں
اس کی رحمت کا کچھ حساب نہیں

شان اس کی بہت ہی اعلیٰ ہے
ہر جگہ اس کا بول بالا ہے

اس نے انسان کو بنایا ہے
اور جینا اسے سکھایا ہے

وہ کھلاتا ہے، وہ پلاتا ہے
وہ ہی مالک ہے، وہ ہی داتا ہے

ساری دنیا پہ ہے اسی کا راج
ساری مخلوق اس کی ہے محتاج

آگ، مٹی، ہوا یا پانی ہے
ہر جگہ اس کی حکمرانی ہے

چاند، سورج، زمین، سیارے
میرے رب نے بنائے ہیں سارے

وہ مصیبت میں کام آتا ہے
سب کی بگڑی وہی بناتا ہے

فرش بھی اس نے ہی بچھایا ہے
عرش بھی اس نے ہی سجایا ہے

آسماں سے برستا یہ پانی
میرے مالک کی ہے مہربانی

رات کو دن وہی بناتا ہے
مشکلوں کو وہی مٹاتا ہے

ہے دعا ارسلان کی یارب
خوش رہیں لوگ اس جہاں میں سب

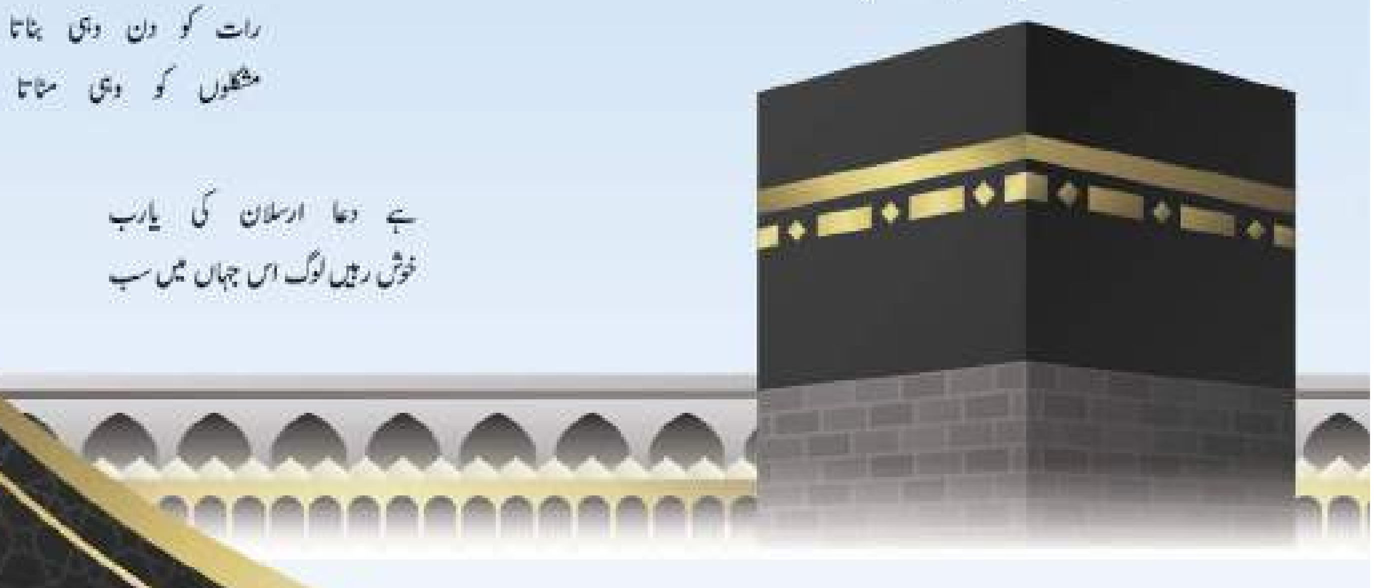

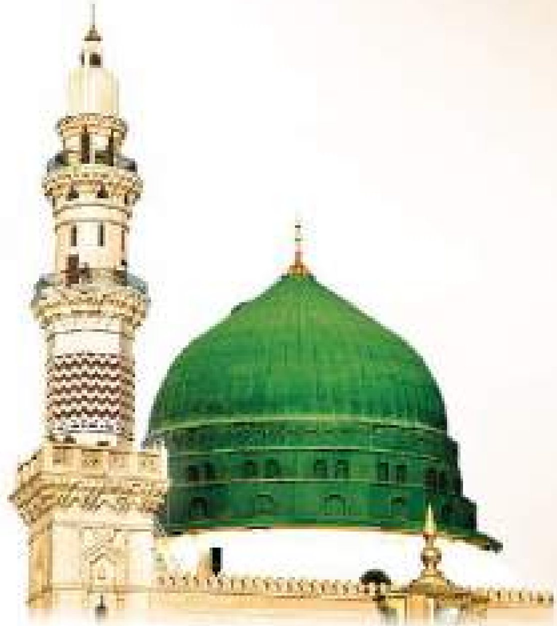

نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

محمد اویس بلوچ

منسلک ہیں آپ ﷺ سے ہم
امتی ہیں آپ ﷺ کے ہم

آپ ﷺ کے آنے سے آئی ہیں بہاریں
مٹ گئے ہیں سارے دکھ اور غم

آپ ﷺ کے بعد آئے گا کوئی نبی نہ
ہے یہ ایمانِ مصمم

چاند، تارے، دھرتی، سورج آج تک سب
آپ ﷺ کے دم سے ہیں قائم

ہے اویس انعام ہم پہ یہ خدا کا
ہمیں پیدا کیا اُس نے مسلم

سزا

روبنسن سیموئیل گل

کچے مکانوں کے بیچ لگی شیشم کی تالی شام ڈھلتے ہی درختوں پرندوں سے بھر جاتی تھی۔ بے شمار پرندے اس قدیم درخت کی بلند شاخوں پر بسیرا کیے ہوئے تھے۔ سب اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹتے تھے۔ تیرہ سالہ انور کا باپ عنایت اللہ بھی کسی لمبے کھیتوں سے واپس لوٹنے والا تھا۔ انور کا دل کر رہا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ جائے یا پھر خدا کرے کے ابا گھر واپس نہ لوٹے۔ مگر یہ خواہش کرتے ہوئے وہ سوچتا بھی تھا کہ آخر یہ کیسی دُعا ہے اگر بالفرض کسی شام واقعی ابا جی گھر کو نہ لوٹے تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر ہی اُسے اپنے بدن میں جُھرجھری سی محسوس ہوئی۔ اُسے ایسی دُعا ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ دوسری جانب اُسے یہ فکر لاحق تھی کہ ابا جی گھر پہنچ کر جو اُس کی دُرگت بنائیں گے، اُس کا کیا ہوگا؟

شام کو رات کی تاریکی نے اتنی تیزی سے اپنی لپیٹ میں لیا کہ ہر شے سیاہ دکھائی دینے لگی۔ پرندے بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر خاموش ہوگئے مگر عنایت اللہ کا اب تک کچھ پتا نہ تھا۔ شاید انور کی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔ انور اپنے چاروں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس لیے ابّا کے بعد گھر کی تمام تر ذمہ داریاں اُسی کے کندھوں پر تھیں۔ وقت سے پہلے ہی اُس نے خوب قد کاٹھ نکال لیا تھا اور پندرہ سولہ برس کا دکھائی دیتا تھا۔

''نہ جانے آج تیرے ابا کہاں رہ گئے؟'' ماں نے فکرمندی سے پوچھا۔

انور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر ابّا کے گلا کھنکارنے کی آواز آئی۔ اُس کی والدہ نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا،

''کہاں رہ گئے تھے انور کے ابا، ہم تو پریشان ہوگئے تھے؟''

''اوہو بھلی مانس! مجھے ذرا دم تو لے لینے دے پھر بتاتا ہوں۔''

ابّا چارپائی پر بیٹھے تو انور نے اُنھیں گھڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی پیش کیا۔ پانی پینے کے بعد اُنھوں نے کندھے پر لٹکنے پرنے سے اپنا منہ پونچھا اور بولے:

''آج رحمو کے دونوں گدھوں نے بہت پریشان کیا۔ ہم کھیتوں میں اپنا کام کرنے میں مصروف تھے اور وہ گھاس چرتے چرتے نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ پھر رات گئے، اگلے گاؤں سے جا کر ملے۔ بھلا ہو طفیلے دُکان دار کا جس نے ہماری رہنمائی کر دی۔ اگر اُس نے گدھوں کو اُس سمت میں جاتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو اُن کا ملنا ناممکن ہو جاتا۔ اگلے گاؤں والے بھی بڑے بھلے مانس تھے، اُنھوں نے دونوں گدھوں کو احتیاط سے دیگر جانوروں کے ساتھ ہی باندھ لیا تھا۔ رحمو نے تو اپنے گدھوں کو فوراً پہچان لیا۔ شکر ہے کہ میرے رَب نے بڑے نقصان سے بچا لیا۔''

انور دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اُن دونوں گدھوں نے آج کی رات اُسے بچا لیا تھا۔

مگر اگلی صبح ماسٹر شفیق نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

''عنایت اللہ صاحب، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ انور اس بار پاس نہیں ہونے والا، اُس کی حاضریاں ہی اتنی کم تھیں۔ جب کچھ پڑھا ہی نہیں تھا تو پاس کہاں سے ہونا تھا؟''
عنایت اللہ یک دم ٹھٹھک گیا۔

''مگر انور تو باقاعدگی سے سکول جاتا ہے، ماسٹر صاحب!''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جاتا ہوگا، مگر آتا نہیں ہے، اگر آئے تو دکھائی نہ دے... پتا کریں کہیں سلیمانی ٹوپی پہن کر تو نہیں آتا؟'' یہ کہہ کر ماسٹر صاحب مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ عنایت اُن کے جملے میں چھپے طنز کو بخوبی سمجھ گیا تھا۔

اُدھر انور کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کل رحمو کے گدھوں نے بچا لیا مگر آج یا کل تو یہ راز کھلنا ہی تھا کہ انور سالانہ امتحان میں فیل ہوگیا تھا۔ وہ بڑی کشمکش کا شکار تھا، ہمیشہ کی طرح وہ اپنے دوست افضل کے ساتھ آموں کے باغ میں چلا گیا۔ ابھی پیڑوں پر پتے تھے، آموں کا نام و نشان نہ تھا۔

''یار افضل! ابو کو پتا چلے گا کہ میں فیل ہوگیا ہوں تو بہت ناراض ہوں گے۔ تیری باتوں میں آ کر میں نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔''

''چل اوئے یار! میں کون سا تجھے اغوا کر کے لاتا تھا جو تُو مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔ یہ کام تو ہم مل کر ہی کرتے تھے ناں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے یار، مگر دیکھ ناں تُو پاس ہوگیا ہے اور میں فیل۔''

''یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ کیسے پاس ہوگیا ہوں؟... بس مر مر کر ہی ہوا ہوں۔'' افضل نے ہنستے ہوئے کہا۔

انور بے دلی سے بولا،

''یار ویسے پڑھائی مجھے دُنیا کا مشکل ترین کام لگتا ہے۔ اب دیکھ ناں، مالی کتنا پُرسکون دکھائی دیتا ہے، یہ درخت لگانا، گوڈی کرنا، اُن کی دیکھ بھال کرنا اور پھر پھل اُتارنا اور پیسے کمانا، کتنا آسان اور مزے کا کام ہے۔ ابو جی بھی کتنے بے فکر ہوتے ہیں، نہ اُستاد کی مار کا ڈر اور نہ امتحانوں کی فکر... واقعی پڑھائی تو نرا عذاب ہی ہے۔''

انور کی ذمہ داری تھی کہ ابو کو کھیتوں میں دوپہر کا کھانا پہنچائے لہٰذا وہ جلدی جلدی گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ابا کو کسی بھی وجہ سے غصہ دلائے۔ اُس کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی ماں نے کھانا باندھ دیا تھا اور اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔

کھیتوں کی جانب جاتے ہوئے انور کو رحمو چاچا مل گئے۔

''ہاں انور پتر سنا کیا حال ہے تیرا؟ جلدی جا تیرا ابا انتظار کر رہا ہے۔ اُس نے ماسٹر شفیق کا منہ دیکھ لیا، اُسے تو صبح سے چُپ ہی لگ گئی ہے۔''

ماسٹر جی کا نام سن کر انور کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔

''اس کا مطلب ہے کہ ماسٹر جی نے ابو جان کو میرے فیل ہونے اور سکول سے غیر حاضریوں کے متعلق بتا دیا ہوگا۔''

انور کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ابو کا سامنا کرے مگر کھانے کا وقت تھا اور ابا جی یقیناً بھوکے بھی تھے۔ چاروناچار اُسے اپنے والد کا سامنا کرنا پڑا مگر یہ کیا اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب باپ نے بڑی شفقت اور گرم جوشی سے اُس کا استقبال کیا۔ دونوں مل کر کھانا کھانے لگے۔

''انور پتر! دیکھ کیسی زبردست فصل تیار ہوئی ہے، بس چند دنوں میں کٹائی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، تُو نے میرے ساتھ ضرور ہاتھ بٹانا ہے۔''

''جی ابو جان، میں کٹائی میں ضرور آپ کی مدد کروں گا۔ آپ مجھے اور بھی کام بتائیں۔'' انور اَب تک تعجب میں مبتلا تھا۔

''تُو ایسا کر، کھانے کے بعد جانوروں کو پانی پلا دے اور پھر اُن کے لیے چارہ بھی کاٹ دینا۔ یہ تو بہت اچھا ہوگا کہ تُو میرے ساتھ ہوگا کیوں کہ رحمو آج جلدی چلا گیا ہے اُس کی گھر والی جو بیمار ہے۔ بس بے چارے کو کوئی نہ کوئی مشکل پڑی رہتی ہے۔''

انور نے خوب محنت و جاں فشانی سے سورج ڈھلنے تک اپنے ابو کے ہمراہ کام کیا اور پھر وہ دونوں اکٹھے ہی جانوروں سمیت گھر کی جانب واپس آ گئے۔

انور نے آدھا دن کام کیا تھا مگر تھکن محسوس کر رہا تھا۔ وہ اَب بھی حیران تھا کہ ابو نے اُس کے امتحان اور نتیجے کے متعلق قطعاً کچھ نہ پوچھا تھا۔

''انور پتر جلدی سو جانا، میں تجھے صبح صبح جگا لوں گا تا کہ ہم اکٹھے ہی کھیتوں میں کام کر سکیں۔''

''کیا انور صبح آپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے جائے گا؟'' اُس کی والدہ نے حیرت سے پوچھا تو عنایت اللہ بولا:

''ہاں! جب تک سکول نہیں کھلتا وہ میرے ساتھ کام کرے گا، ویسے بھی میں نے دیکھا ہے کہ اُسے کھیتوں میں کام کر کے بے حد خوشی ہوئی ہے۔''

سچ تو یہ تھا کہ انور کو اس بات کی خوشی تھی کہ اُس کے ابو نے اُس سے سالانہ امتحانوں کے نتیجے کے متعلق اَب تک کچھ نہ پوچھا تھا۔ تاہم اَب جب منہ اندھیرے اُٹھنے کے متعلق سُنا تو قدرے پریشان ہوگیا۔ اگلے چند دن اُس کا یہی معمول رہا۔ وہ سورج طلوع ہونے سے پیشتر اپنے ابو کے ہمراہ بیلوں اور گدھوں کو کھیتوں کی جانب لے کر جاتا، پھر دوپہر کو گھر سے اپنے اور ابو کے لیے دوپہر کا کھانا لاتا۔

اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب ایک روز ابو نے اُسے نہر پر جانے کا کہا مگر شرط یہ تھی کہ اُس نے اکیلے نہیں جانا بلکہ تمام جانوروں کو ہمراہ لے کر جانا اور اُن کو نہلانا تھا۔ اُس نے اپنے دوست افضل کو بھی ہمراہ لے لیا۔ اُس روز دونوں دوستوں نے خوب گپ

شپ لگائی، ہلا گلا کیا، نہر پر نہائے بھی مگر افضل کا دل بیلوں اور گدھوں کو نہلانے سے اُچاٹ ہو گیا چنانچہ سارا کام انور کو ہی بے دلی سے کرنا پڑا۔

اُس شام جب انور گھر لوٹا تو اُسے بہت ہی شرمندگی ہوئی کیوں کہ تالاب کے نیچے نہا لینے کے باوجود جب وہ اپنے چھوٹے بھائی منور کے پاس بیٹھا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا،

''اَب تو بھیا سے گدھوں اور بیلوں والی بُو آتی ہے۔''

اُس کا باپ یہ سُن کر مسکرا دیا جب کہ انور کو یہ بات بہت بُری لگی۔ اُس روز سے اُسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی اور ہر وقت ایسا محسوس ہونے لگا کہ واقعی اُس کے بدن اور کپڑوں سے جانوروں والی بدبُو آ رہی ہے۔ اُس کی والدہ بڑے دھیان سے کپڑے دھوتیں تو بھی وہ صاف جوڑے کو بار بار سونگھتا رہتا تھا۔ شام تک پسینے اور گرد کے باعث اُس کے ہر جوڑے کا ایک سا حال ہوتا۔ نہر پر افضل نے اُس کے ساتھ اُسی روز وقت گزارا اَب اُس کے بعد سے وہ بھی انور سے ملنے سے کتراتا تھا کیوں کہ اس کے کپڑے میلے کچیلے ہوتے یا پھر وہ جانوروں کو ہانک رہا ہوتا تھا۔

لہلہاتی گندم کی فصل پک کر یوں دکھائی دے رہی تھی کہ گویا سنہری چادر لہرا رہی ہو۔

''انور پتر بس اَب کل سے ہم کٹائی کا کام شروع کر دیں گے۔ کھانا لانے کی ذمہ داری منور پتر کی ہوگی۔ تُو نے میرے اور رحمو چاچا کے ساتھ مل کر کٹائی کرنی ہے۔ پانی شانی زیادہ پینا بلکہ نمک ڈال کے پیتے رہنا، دھوپ بہت تیز ہوگی... گرمی بُری تو لگتی ہے مگر فصلیں اور پھل بھی تو اسی کی وجہ سے پکتا ہے، سوہنے رب کے سوہنے کام ہیں۔''

انور اَب ان سب کاموں سے قدرے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ منہ اندھیرے کاموں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اُسے یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا کئی مہینوں سے اُس کی نیند پوری نہیں ہوئی حالاں کہ ابھی تو اُسے اپنے ابا کے ہمراہ کام کرتے ہوئے دو ہفتے بھی نہ ہوئے تھے۔ ابا کے کہنے پر گائے کا دودھ دوہنے کی ذمہ داری بھی ماں نے انور کے سپرد کر دی تھی پھر دن بھر ابا کے ساتھ کھیتوں میں کوئی نہ کوئی کام کرتے رہنا، جانوروں کی دیکھ بھال کرنا اور اَب تیار فصل کی کٹائی، انور کو تو یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اَب واقعی اُس کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔

یہ کام اتنے آسان نہ تھے جتنے بظاہر دکھائی دیتے تھے۔ کسان بیج بوتا ہے تو اُسے خوب محنت کرنا پڑتی ہے... یہ بھی تو اُس کا امتحان ہوتا ہے کہ آیا فصل اُس کی توقع کے مطابق اُگے گی یا نہیں۔ بارش اگر طوفان کا روپ دھار لے تو یہ بھی اُس کا امتحان ہوتا ہے۔ پانی کی قلت ہو جائے یا جڑی بوٹیاں فصل کو نقصان پہنچانے لگیں یا پھر کیڑے مکوڑے فصل پر حملہ کر دیں تو یہ بھی تو اُس کا امتحان ہوتا ہے۔ اسی طرح مالی بھی پودوں اور درختوں پر خوب محنت کرتا ہے۔ فصل اُگانا اور پھل پیدا کرنا تو خدا تعالیٰ کا ہی کام ہے مگر انسان کو دن رات محنت تو خود ہی کرنا پڑتی ہے۔

کام کاج کرتے ہوئے انور اکثر ان ہی باتوں پر غور و خوض کرتا رہتا تھا۔ سکول کھلنے والے تھے اور اَب بچوں نے اگلی جماعتوں میں بیٹھنا تھا مگر انور تو پاس ہی نہ ہو سکا تھا۔ ان ڈیڑھ دو ہفتوں میں اُس کے والد نے اُس سے ایک بار بھی نتیجے کا نہ پوچھا تھا، ویسے بھی وہ اپنے والد کا ہر کام تن دہی سے کرتا رہا اور یہی سمجھتا رہا کہ اُس نے ابا کو خوش اور مطمئن رکھا ہوا ہے۔

ایک روز جب اُس نے افضل کو صبح صبح تیار ہوئے دیگر لڑکوں کے ساتھ سکول کی جانب جاتے دیکھا تو وہ دل ہی دل میں کُڑھنے لگا۔ اُس نے خواہ مخواہ ایک سال ضائع کر دیا تھا۔ اَب وہ طالب علموں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا چنانچہ باپ نے مسکراتے ہوئے کہا،

''انور پتر تُو نے میرا ان دنوں خوب ہاتھ بٹایا ہے۔ مَیں بہت خوش ہوں مگر اس سے بھی زیادہ خوش ہوں گا اگر تُو دھیان سے پڑھائی کرے گا۔ تجھے بھی معلوم ہے کہ مجھے ماسٹر شفیق سے تیرے فیل ہونے کا پتا چل گیا تھا مگر مَیں نے اور تیری ماں نے تجھے انوکھی سزا دینے کا سوچا تا کہ تُو اچھے طریقے سے زندگی کے متعلق سیکھ لے۔ بیٹا زندگی بذاتِ خود ایک امتحان ہے۔ ہر دن ایک نیا امتحان۔ اسے بڑی محنت اور حکمت سے گزارنا پڑتا ہے پھر ہی انسان کامیاب ہوتا اور دوسروں کے لیے بھی برکت کا باعث بنتا ہے یعنی دوسرے بھی اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔''

آج انور نے وہ سبق سیکھ لیا تھا اور اُسے اپنے ابا پر بے حد پیار آ رہا تھا۔ وہ اتنی محنت اسی لیے کرتے تھے تا کہ اُن کے بچے تعلیم حاصل کر کے بڑے آدمی بن سکیں۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ اُن کا بیٹا شہر کے کسی بڑے سکول میں ماسٹر ہو۔ اُس روز سے انور نے خوب دل لگا کر پڑھنا شروع کیا اور آخر اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ہی میٹرک کے امتحان دیے۔ اُس نے نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔ کیوں کہ پڑھائی اُسے بوجھ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اپنے باپ کی شفقت، نصیحت اور خواب کو ذہن میں رکھتے ہوئے انور ہر امتحان میں کامیاب ہوتا رہا اور آخر کار شہر کے کسی سکول میں ماسٹر ہی نہیں بلکہ ایک بڑے سرکاری کالج میں لیکچرار بن گیا۔

اُس کا باپ کس قدر خوش تھا۔ شاید اگر اُس روز وہ سختی یا مار پیٹ کر کے انور کو پڑھائی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا تو اُس کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پڑھائی سے اُچاٹ ہو جاتا مگر عنایت اللہ نے بڑی حکمت سے انوکھے انداز میں سزا دے کر انور کو خود موازنہ کرنے اور درست فیصلہ کرنے کی ترغیب دی۔ عنایت اللہ تو شاید بھول چکا تھا مگر پروفیسر انور عنایت اللہ اُس سزا کو کیسے بھلا سکتا تھا؟ وہ ہر جماعت میں اپنے طالب علموں کو اپنی اور اپنے باپ کی اُس انوکھی سزا کے متعلق کہانی سنا کر علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتا رہا۔

☆......☆......☆

طوطے کے گیت

مدیحہ شاہد

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ندی کنارے گھنے درختوں والا سر سبز جنگل تھا جہاں بہت سے پرندے رہتے تھے۔ اخروٹ کے درخت پر نیلی چڑیا کا گھونسلہ تھا۔ اس کے قریب ہی سفید پھولوں سے لدے خوبانی کے درخت پر سبز طوطے کا مسکن تھا، جس کی گردن پر ہار کی طرح کا سرخ دائرہ بنا ہوا تھا۔ چڑیا اور طوطے میں بہت دوستی تھی۔ بہار آتی تو وہ دونوں مل کر خوشی کے گیت گاتے جاڑا آتا تو اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک جاتے۔ موسم گرما میں ندی کنارے پائے جاتے اور برسات میں درختوں کی شاخوں میں چھپ کر سرگوشیوں میں باتیں کرتے۔ طوطے کو گیت گانے کا بہت شوق تھا اور اس کی آواز بہت سریلی تھی اور جنگل میں اس کے گیتوں کی بازگشت گونجتی رہتی تھی۔

ایک دن وہ دونوں اُڑتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ جاڑے کی آمد تھی اور خوراک کی قلت بھی تھی۔ ان کا گزر ایک کھیت پر سے ہوا۔ طوطے نے دیکھا کہ کھیت کے کنارے باجرے کے دانے اور کچھ پھل رکھے تھے۔ کھیت سنسان تھا، وہاں کوئی انسان بھی نہ تھا جس کا انھیں خوف ہوتا۔

طوطا یکدم ٹھہر گیا، اس نے چڑیا کو متوجہ کر کے کہا۔

”نیلی چڑیا! وہ دیکھو کھیت کے کنارے اناج اور پھل رکھے ہیں۔ آؤ وہاں سے ہم کچھ کھانے کے لیے لے لیتے ہیں۔“ چڑیا عقل مند تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی اس نے طوطے کو منع کیا۔

”رُک جاؤ طوطے، نیچے مت اترو، مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی انسان کی سازش ہے۔ ضرور وہاں کسی شکاری نے جال بچھایا ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ انسانوں کا بچھایا گیا جال بہت خطرناک ہوتا ہے۔“

مگر طوطے نے اس کی بات نہ مانی۔

”چڑیا وہم نہ کرو، شاید کسی نیک انسان نے پرندوں کے کھانے کے لیے چیزیں رکھی ہیں۔“

طوطے نے سادگی سے کہا اور نیچے اُتر گیا۔ کھیت سنسان تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ طوطے نے اطمینان سے امرود کو چونچ سے پکڑ اگر یہ کیا، وہاں واقعی جال بچھا ہوا تھا اور وہ

اب جال میں پھنس گیا تھا۔ اس نے بے ساختہ چیخ ماری مگر بے سود۔ وہ اب جال سے نکل نہیں سکتا تھا اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ چڑیا یہ ماجرا دیکھ کر ڈر گئی اور بے بسی سے پر پھڑ پھڑانے لگی۔

"طوطے، میں نے تمھیں کہا تھا کہ نیچے مت اترو۔ ضرور یہ کسی شکاری کی چال ہے۔ اب کیا ہوگا، میں کس طرح تمہاری مدد کروں؟" چڑیا پریشانی سے بولی۔

کچھ دیر بعد قریب ہی واقع لکڑی کے گھر سے ایک شکاری باہر نکلا، اس نے طوطے کو پکڑ کر ایک پنجرے میں قید کر لیا اور اسے اس گھر میں لے گیا۔ طوطا شور مچاتا رہ گیا چڑیا بے چاری کچھ نہ کر سکی۔

شام ڈھلے وہ اداسی سے واپس جنگل میں آ گئی۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے طوطے کو یاد کرتی رہی۔ اسے دکھ تھا کہ طوطے نے اس کی نصیحت نہ سنی تھی۔ اس کا دوست اس سے بچھڑ گیا تھا اس لیے، وہ اداس رہنے لگی۔ اب جنگل میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔

طوطے کو بھی چڑیا کی بات نہ ماننے کا پچھتاوا تھا۔ شکاری اسے بازار لے گیا۔ ایک سنہری بالوں والی لڑکی نے اس طوطے کو خرید لیا اور وہ اسے خوشی خوشی اپنے گھر لے آئی۔ اس لڑکی کا نام سونی تھا۔ سونی کو معلوم ہو گیا کہ وہ نایاب نسل کا طوطا ہے۔ طوطا جلد ہی انسانوں کی زبان سیکھ گیا۔ لڑکی جو کچھ کہتی وہ وہی کچھ دہراتا۔ لڑکی کو اس سے بے حد محبت ہو گئی۔

وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی۔ روزانہ اس کا پنجرہ صاف کرتی، کٹوری میں تازہ پانی بھر کر رکھتی۔ اس کے لیے پھل لے کر آتی جہاں جاتی طوطے کو اپنے ساتھ لے کر جاتی اور اس سے باتیں کرتی، مگر پھر بھی طوطا اداس تھا وہ پنجرے کی سلاخوں کے پار باہر کے نظارے دیکھتے ہوئے اداس گیت گاتا رہتا۔

کچھ دنوں بعد نیلی چڑیا اڑتے ہوئے ایک بستی کے اوپر سے گزری تو اس نے طوطے کے گیت کی آواز سنی، اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو ایک گھر کی چھت پر ایک لڑکی دھوپ میں بیٹھی تھی اور ساتھ اس کا دوست طوطا پنجرے میں قید گیت گا رہا تھا۔ وہ بے تابی سے چھت کی دیوار پر بیٹھ گئی۔ طوطے نے چڑیا کو دیکھا تو بے قرار ہو گیا۔ سونی بھی چھت کی دیوار پر بیٹھی نیلی چڑیا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

طوطا سونی کی طرف دیکھ کر اداسی سے بولا۔

"یہ چڑیا میری دوست ہے، ہم جنگل میں ساتھ رہتے تھے یہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ گئی ہے۔ اچھی لڑکی مجھے آزاد کر دو۔"

سونی نے چونک کر طوطے کو دیکھا۔

"میاں مٹھو! کیا تمھیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟ کیا میں تمہارا خیال نہیں رکھتی ہوں؟"

سونی نے بے ساختہ کہا۔ طوطے نے احسان مندی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے اچھی لڑکی، تمہارے مجھ پر بہت احسان ہیں، مگر پنجرہ چاہے سونے کا بھی ہو، اس میں قید رہنے والا غلامی کے دکھ اٹھاتا ہے۔ یہ پنجرہ بہت خوبصورت ہے، یہاں مجھے سب کچھ میسر ہے مگر اس میں قید ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ ہر پرندے کو آزاد فضا میں اڑنے کی خواہش ہوتی ہے اور یہی اس کی خوشی ہوتی ہے۔ اگر تم مجھے آزاد کر دو گی تو میں تمہارا احسان مند رہوں گا اور تمھیں دعائیں دیتا رہوں گا۔" طوطے نے اداسی سے کہا۔

سونی اداس ہو گئی۔ وہ طوطے کو پسند کرنے لگی تھی۔ اس کے گیت اسے اچھے لگتے تھے۔ سونی نے کچھ دیر سوچا پھر آہستگی سے پنجرے کا دروازہ کھولا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میاں مٹھو، ہمیں اپنی خوشی سے زیادہ دوسروں کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں تمھیں آزاد کرتی ہوں۔ جاؤ، اپنے جنگل واپس لوٹ جاؤ۔"

سونی ایک رحم دل لڑکی تھی۔ اس نے طوطے کو آزاد کر دیا۔ طوطا خوش ہو گیا۔

"شکریہ اچھی لڑکی! میں کبھی کبھار تم سے ملنے آتا رہوں گا۔"

اس نے خوشی کے عالم میں کہا۔

نیلی چڑیا بھی خوشی سے اپنے پر پھڑ پھڑانے لگی۔ اس کا دوست آزاد ہو گیا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ طوطے نے اڑان بھری اور فضا میں پر پھیلاتے ہوئے اڑ گیا۔ نیلی چڑیا بھی خوش خوش اس کے ساتھ اڑنے لگی۔ بچھڑے ہوئے دوست آخر کار مل گئے۔ دونوں پرندے اڑتے ہوئے جنگل کی جانب چلے گئے۔ سونی اپنی چھت پر کھڑی مسکراتے ہوئے انھیں اڑتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی مگر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

سچ ہے کہ ہمیں اپنی خوشی سے زیادہ دوسروں کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔

☆......☆......☆

لال گلاب

پھول ایک ایسا انمول تحفہ ہے جو کہ نہ صرف دیکھنے میں اچھا لگتا ہے بلکہ اس کے بہت سے فوائد بھی ہیں پھول جو کہ اکثر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں وہاں یہ بہت سے لوگوں کی محبت کا ذریعہ بھی بنتا ہے اور یہ خاص طور پر لوگوں کے نزدیک محبت کرنے والوں کے لیے ہی بنا ہے اس میں ایک خاص گلاب جو کہ لوگوں کو پسند ہے اور اسے بہت سے لوگ محبت کرنے والے ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور یہ بہت ہی خوبصورت گلاب ہے یہ گلاب بہت ہی پیارا اور بہت ہی دل کو چھونے والا ہے یہ سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور بہت سے لوگ اسے پسند کرتے ہیں اور اس کی خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کا عرق نکال کر آنکھوں میں ڈالا جاتا ہے اور دیکھنے میں بھی بہت ہی خوبصورت لگتا ہے۔

کوہ پیماء کا ایڈونچر

فضہ شکیل

سورج کی ہلکی نارنجی شعاعیں پہاڑ پر جمی برف کو مزید چمکا رہی تھیں۔ دامن میں بیٹھے، سامنے پہاڑ پر نظریں ٹکا کر دیکھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ کیٹ (keat) ایک کوہ پیما تھا جس کا پسندیدہ ملک پاکستان تھا، جس سے محبت کا اظہار اس نے اردو سیکھ کر کیا۔ آج وہ اپنی سب سے من پسند جگہ پر بیٹھا تھا۔ وہ یہ ایڈونچر کرنے کے لیے بے چین تھا۔ چار سال انتظار کرنے کے بعد اب اس نے سوچ لیا تھا کہ اس پہاڑ تک جانا ناگزیر ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ پہاڑ فاصلے سے جس قدر دل کش ہے قریب سے اتنا ہی خوف ناک ہوگا۔

''سورج غروب ہو رہا ہو تو میں اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہوں۔ چڑیلیں اور پریاں اس پر قابض ہو جاتی ہیں۔'' اس ظالم پہاڑ کے دامن میں رہنے والے لوگ کتنے معصوم تھے نا۔

مقامی بچوں کے ساتھ بیٹھے وہ قہوہ پیتے مہمان نوازی کا لطف لے رہا تھا۔ پہاڑوں کی باتیں کرتے ہوئے تیرہ سالہ زین کی بات سن کر کیٹ نے قہقہہ لگایا۔ آنکھیں ایک مرتبہ پھر اس چوٹی کی طرف اٹھیں، اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اس کے سحر سے نکل کر اس تک جائے، اس مضبوطی سے تنے پہاڑ کو سر کرے۔ وہ سارا دن کیٹ نے بچوں کے ساتھ گزارا تھا۔ سب کے دلوں میں خوف تھا، پہاڑ سے جڑی لوک کہانیوں کو لے کر۔

''جس دن ہم چڑیل سے لڑنا سیکھ گیا اور اس سے ڈرنا چھوڑ دیا، اس دن ہم بھی آپ کے ساتھ پہاڑ پر جائیں گے۔''

وہ بچہ پھر گویا ہوا۔

''تمھیں میں اس بار اپنے ساتھ ہی نہ لے جاؤں؟'' کیٹ نے شرارت بھرے لہجے میں بات کی۔

''بھائی معاف کرو ابھی ہم چھوٹے ہیں، انھوں نے واپس نہیں آنے دینا۔''

قریب بیٹھے سب ہنس پڑے۔ لیکن کیٹ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ چمکتی ہوئی، کچھ پا لینے کو تیار کالی آنکھیں۔

''ہاں، اس وادی نے بہت بڑے بڑے کوہ پیما پالے ہیں، ان میں ایک اب تم بھی ہو گے۔'' کیٹ نے دل میں سوچا اور زیر لب مسکرا دیا۔

☆

نیپالی خاتون کوہ پیما کے ساتھ کیٹ نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ سورج کی تیز روشنی جب برف سے ٹکراتی اور آنکھوں پر پڑتی تو آنکھیں کھولنا ناممکن ہو جاتا۔ حفاظتی چشمے ان کی آنکھوں کی حفاظت کر رہے تھے۔

’’دھیان سے! کوئی غلطی نہ کرنا۔‘‘ ایک ساتھ برفیلی بلندی تک چڑھتے وہ آپس میں ہلکی پھلکی بات چیت کر رہے تھے۔

’’میں جانتا ہوں، یہاں غلطیوں کی سزا دی جاتی ہے۔‘‘

خاتون کو وہ پیا نے کیٹ کو مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

’’تمہیں معلوم ہے، اس پہاڑ کو سر کرنے کی یہ میری پانچویں کوشش ہے۔‘‘

’’یہاں کی پریاں شاید آپ کو اپنے محل تک نہیں جانے دینا چاہتیں۔‘‘

موسم سخت تھا لیکن لہجوں کو خوش گوار رکھا گیا۔

’’تم نے اس سے پہلے کوشش نہیں کی؟‘‘

’’نہیں میں نے بہت سے پہاڑ سر کر لیے ہیں لیکن اس سمت میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔‘‘

چند لمحوں کے لیے کیٹ رک گیا تھا۔ نظروں کا مرکز سفید برف سے ڈھکا راستہ تھا۔

☆

چھ ہزار میٹر کی بلندی طے ہو چکی تھی۔ طوفان شروع ہو چکا تھا اس لیے آگے بڑھنا اس وقت ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سلیپنگ بیگ کھول لیے، برف سے بنی دیواروں اور ان میں موجود دراڑوں سے ٹکراتی ہوائیں ہولناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کو وہ پیا کی ٹریننگ میں اگر ان سب باتوں کے لیے تیار نہ کیا جاتا ہوتا تو سننے والے کا دل دہل جاتا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیٹ کو لگا کہ سردی اگر مزید بڑھی تو وہ یہاں کسی بھی کیمیکل کے بغیر ہی حنوط ہو جائے گا۔

’’کیٹ! موسم زیادہ بگڑ گیا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں سفر روک دینا چاہیے۔‘‘

’’رک جانا موت بن سکتا ہے۔‘‘ کیٹ کی آواز میں مایوسی تھی۔

’’ہم واپسی کا سفر شروع کرتے ہیں، اوپر جانا بھی خطرہ ہے۔‘‘

دونوں باہمی فیصلے سے نیچے اترنے کی طرف گامزن ہوئے۔ اس پہاڑ کا سحر اور اس سے الفت پچھاور بڑھ گئی تھی لیکن کہیں نہ کہیں عداوت میں بھی اضافہ ہوا۔ آخر یہ پہاڑ اتنا ظالم کیوں تھا؟ اس کو سر کرنا ہر مرتبہ مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

☆

اداس دل کے ساتھ دونوں طوفان اور ہواؤں کو چیرتے نیچے کی طرف آ رہے تھے۔ تھکاوٹ ہونے پر کچھ دیر رکتے اور سفر کی خاطر توانائی اکٹھی کرتے۔ ہوا کی سرسراہٹ اور برف گرنے کا شور پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ برف میں بنے چھوٹے بڑے شگاف حوصلہ پست کر رہے تھے۔

’’چلنا مشکل ہو رہا ہے۔‘‘

’’میرے پاؤں اب شل ہو رہے ہیں۔‘‘

’’یہ عجیب و غریب سی آواز کس شے کی ہے؟‘‘

تکلیف کی شدت کو برداشت کرتے کیٹ بولا۔

’’یہ جو پاؤں کے نیچے برف ہے، یہ ہمیں سالم نگلنے کو تیار ہے۔‘‘

نیپالی خاتون پر تھکاوٹ طاری تھی۔ ’’میں سونا چاہتی ہوں۔‘‘

’’یہاں سویا نہیں جا سکتا۔‘‘

کیٹ کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی جب دونوں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا، جہاں ایک برف کا تودہ کسی برفانی چیتے کی طرح ان تک آ رہا تھا۔ صورت حال سمجھتے ہوئے جب تک وہ ہلنے کے قابل ہوئے تب تک وہ تودہ ان کے قریب سے ممکنہ تباہی کرتے گزر گیا۔ نیپالی خاتون اور کیٹ کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

کیٹ نے اپنے قدم سنبھالنے چاہے لیکن وہ بھی حواس کی طرح بے قابو ہوتے گئے۔ کسی چھوٹی چٹان سے ٹکراتے کیٹ گر گیا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سرد موت اور اس اونچائی پر اپنا انجام دیکھتے اس کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ ہتھیلی کے نیچے موجود برف اسے سمیٹنے کو بے تاب تھی۔ آخری مرتبہ آنکھیں گھماتے اس نے اوپر دیکھا جہاں چوٹی شان سے تنی تھی، اس کے چہرے پر بے ساختہ ہلکی مسکراہٹ ابھری۔

’’شاید پریوں سے ملنے کا وقت آ گیا ہے۔‘‘

اب وہ کوئی بھی منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔

☆

آنکھیں کھلیں تو سر پر ہلکی سفید روشنی چمک رہی تھی۔

’’کیا واقعی؟ میں پہاڑ کی پریوں سے ملنے آ گیا ہوں۔‘‘ کیٹ نے خود سے کہا۔

’’کیسے ہیں آپ؟ آپ کو بہت مشکل سے ریسکیو کیا گیا ہے۔ آپ کی کمر پر زخم آئے ہیں۔‘‘ بنا رکے بولنے والی نرس اب خاموش ہوئی۔

’’مجھے ریسکیو کس نے کیا؟‘‘ ذہن میں مچلتا سوال کیٹ نے جلدی سے کیا۔

’’آپ کے ساتھ موجود نیپالی کوہ پیما نے۔ پانچ سو میٹر نیچے تک وہ آپ کو اکیلی لائیں۔ اس کے بعد انہوں نے مدد مانگی۔ وہ بھی زخمی ہیں اور ابھی زیر علاج ہیں۔‘‘

’’اب میں ایک مرتبہ پھر اس پہاڑ تک جا سکتا ہوں۔‘‘ اس سوچ نے کیٹ کو خوش کر دیا تھا۔ حادثے نے پہاڑ کا خوف کچھ کم کر دیا تھا۔

’’دو چار کوششیں کر کے میں اس برف پوش پہاڑ کی پریوں سے مل ہی لوں گا۔‘‘ خود سے باتیں کرتے کیٹ ہنس دیا۔

☆

پانچ سال بعد کیٹ آج چوتھی مرتبہ خوب صورت پہاڑ کو سر کرنے کے لیے پر عزم تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں میں اس نے وادی کے ذہن کو تیار کیا تھا۔ وہ بچہ اب نہ چڑیلوں سے ڈرتا تھا نہ سورج غروب ہوتے وقت پہاڑ سے اپنی نظریں ہٹاتا تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر: 43

دن عید کا

محمد رمضان شاکر

دن ہے عید کا منائیں خوشیاں
مل کے جہاں میں پھیلائیں خوشیاں

پھر آئے مزہ عید کا دوستو
گھر گھر جو پہنچائیں خوشیاں

انجانی سی اک خوشی ملتی ہے
مل جل کے جب منائیں خوشیاں

اوروں کو خوشی میں شامل کرکے
آ سارے مل کے کمائیں خوشیاں

کبھی اس رنگ کبھی اس رنگ
شاکر کے دل کو لبھائیں خوشیاں

دن ہے عید کا منائیں خوشیاں
مل کے جہاں میں پھیلائیں خوشیاں

شاہین

برگد کی چڑیلیں

عمیرہ احمد

"میرے گھر میں ایک پرانا برگد ہے جس پر چڑیلیں رہتی ہیں جو ہمیں بہت تنگ کرتی ہیں۔ کیا ٹیم شاہین مجھے برگد کی ان چڑیلوں سے چھٹکارا دلوا سکتی ہے؟"

شیر دل نے کاغذ پر انگلش میں لکھی ہوئی اُس تحریر کو با آواز بلند پڑھا تھا اور نایاب اور احد یک دم بہت ہی پرجوش نظر آنے لگے تھے۔

"یہ ہوا نا کیس......بس یہ ہی تفتیش کریں گے ہم سب سے پہلے۔" نایاب نے سکول کی ڈیسک پر ہاتھ مار کر جیسے حتمی فیصلہ کر دیا۔

"کیس ہے کس کا؟" احد نے شیر دل سے پوچھا۔

"یوحنا جوزف کلاس فائیو۔" شیر دل نے اُس کاغذ کے نیچے لکھا نام پڑھتے ہوئے کہا جو ٹیم شاہین کے لاکر میں کسی نے ڈالا تھا۔

وہ تینوں آج وہ لاکر کھول کر اس میں موجود وہ سارے خطوط پڑھ رہے تھے جو سکول کے مختلف بچوں نے ٹیم شاہین سے رابطے کے لئے اپنے مسئلے کے ساتھ بھیجے تھے، اور پچھلے آدھے گھنٹے میں کوئی ایک کیس ایسا نہیں تھا جو اُن کے دل کو لگتا۔ وہ عجیب عجیب مسائل تھے جو بچوں نے کیس بنا کر انہیں بھیج دیئے تھے۔ کسی کو اپنی وہ والی بلی کی تلاش کروانا تھی جو تین سال پہلے غائب ہوگئی تھی اور کسی کو اپنے گھر کے چوہوں سے نجات چاہیے تھی۔ کسی کو اپنے موزوں سے بدبو کا مسئلہ حل کروانا تھا اور کسی کو کھجلی کی شکایت پر ان سے رہنمائی چاہیے تھی۔ کسی کو اپنے چھوٹے بہن بھائی کو پٹوانا تھا اور کسی کو اپنے بڑے بہن بھائی کو اغوا کروانا تھا۔ وہ تینوں مسئلے پڑھ پڑھ کر تپ رہے تھے۔ وہ ٹیم شاہین تھے اُس سکول کی پہلی "جاسوس تنظیم" اور وہ انہیں احمقانہ کیس لکھ لکھ کر بھیج رہے تھے۔ اُن تینوں کا موڈ بے حد خراب ہو گیا تھا، تب ہی اُن کے ہاتھوں یوحنا جوزف کا وہ کیس آیا تھا اور یک دم وہ تینوں جیسے کھل اُٹھے تھے۔

یہ شیر دل شیرازی تھا جسے جاسوسی ناولز پڑھنے اور فلمیں دیکھنے کا جنون تھا اور اس ہی جنون نے اُسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ خود بھی جاسوس بن سکتا تھا۔ وہ اخباروں اور ٹی وی پر مختلف جرائم کی خبریں سنتا اور پھر انٹرنیٹ پر تب تک اُن کیسز کو فالو اپ کرتا رہتا جب تک وہ حل نہ ہو جاتے اور مجرم پکڑا نہ جاتا۔ اکثر اوقات شیر دل کے جو اندازے مجرم کے بارے میں ہوتے تھے وہ صحیح ثابت ہوتے تھے اور ایسا ہونے پر وہ خوشی سے بے قابو ہو جاتا۔ احد اُس کا بہترین دوست تھا اور نایاب اُس کے چچا کی بیٹی اور وہ دونوں اُس کے کلاس فیلوز بھی تھے اور شیر دل کے اس جنون سے واقف بھی لیکن شیر دل کے ذہن میں جب ایک جاسوسی تنظیم بنانے کا خیال آیا تھا تو اُس نے اُن دونوں کو بھی مکمل طور پر بے خبر رکھا تھا۔ وہ اُس وقت تک شرلاک ہومز سے متاثر تھا مگر شرلاک ہومز کی طرح ایک بھی ساتھی رکھنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اُس کا خیال تھا وہ سب خود کر سکتا تھا۔

شاہین کا نام اُس نے اپنی دادی سے علامہ اقبال کے اشعار میں شاہین کا ذکر سن کر سوچا تھا۔ اُسے وہ پرندہ، اُس کی پرواز اور اس سے منسلک شاعرِ مشرق کا "فلسفۂ خودی" پسند تھا۔ شاہین بھی اکیلا اونچی پرواز کرتا اپنے ہدف پر جھپٹتا تھا اور شیر دل شیرازی بھی اُس ہی کی طرح تھا اُس تنظیم کو چلانا چاہتا تھا جس کا اس وقت وہ بانی تھا۔

گھر بیٹھے اُس نے خود ہی ایک دن شاہین کے اغراض و مقاصد لکھ لئے تھے۔ وہ تنظیم کیا کیا کر سکتی تھی اور کیسز حل کرنے کے لئے جو معاوضہ شاہین لیتی شیر دل نے اُس کا بھی تعین کر لیا تھا۔ ایک ویب سائٹ بنا کر اُس نے شاہین کے لوگو کے ساتھ یہ ساری معلومات وہاں پر چڑھا دیں اور اپنا ای میل ایڈریس اور سکول میں ایک لاکر نمبر ایک pamphlet پر ڈیزائن کر کے اُس نے سکول کے نوٹس بورڈ پر لگا دیا۔ ایک گھنٹے میں ہی شاہین کا لفظ پورے سکول میں گردش کرنے لگا تھا اور نوٹس بورڈ کے نیچے بچوں کا ہجوم اکٹھا ہونے لگا تھا۔

''ہم سکول کے بچوں کے کیسز حل کرنے والی پاکستان کی سب سے بڑی جاسوسی تنظیم ہیں جس کی شاخیں عنقریب پاکستان بھر کے سکولوں میں کھولی جانے والی ہیں اور اس سکول میں شاہین کا ہیڈ کوارٹر کھولا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس جدید ترین جاسوسی کے آلات ہیں اور ٹیکنالوجی پر مہارت رکھنے کی وجہ سے ہم آپ کا کوئی بھی مسئلہ منٹوں میں حل کر سکتے ہیں۔

شاہین آپ کی زندگی کو مسائل سے پاک وہ پرواز دے گی جس کے آپ اہل ہیں تو آئیں آج ہی اپنی ہر پریشانی اور مسئلے کے حل کے لئے ہم سے رابطہ قائم کریں۔'' شیر دل جانتا تھا اُس نے اپنی تنظیم کا تعارف کرواتے ہوئے تھوڑی نہیں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا لیکن جھوٹ نہ بولنے پر یقین رکھنے کے باوجود اُس کا خیال تھا پروموشن کے لئے تھوڑا بہت مبالغہ ضروری تھا اور ویسے بھی وہ جو اُس pamphlet میں لکھ رہا تھا وہ ایک دن سب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

''سنو، یہ شاہین ٹیم تم نے بنائی ہے نا؟'' نایاب نے سکول میں اُس pamphlet کو پڑھتے ہی شیر دل سے پوچھا تھا۔ شیر دل نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''میں صرف اس آرگنائزیشن کا فوکل پرسن ہوں اور کچھ نہیں۔''

''جھوٹ مت بولو، ویب سائٹ تم نے بنائی ہے۔'' شیر دل بھونچکا رہ گیا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''گھر میں Networking ہے سارے کمپیوٹرز کی۔ تم رات کو بیٹھے یہ بنا رہے تھے اور میں بھی دیکھ رہی تھی۔'' نایاب نے بڑے اطمینان سے اُسے بتایا اور شیر دل دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ نایاب اگر پروگرامر نہ ہوتی تو پھر ہیکر ہوتی، وہ کسی بھی کمپیوٹر کا پاس ورڈ بدل سکتی تھی۔ کسی بھی سسٹم اور سافٹ ویئر تک رسائی کر سکتی تھی۔ انٹرنیٹ پر موجود کسی بھی ویب سائٹ کے بیک اینڈ تک رسائی حاصل کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ شیر دل کو پچھتاوا ہوا کہ اُس نے اس ویب سائٹ پر کام کرتے ہوئے Networking ختم کیوں نہیں کی۔

''او کے! لیکن اب اپنا منہ بند رکھنا۔'' شیر دل نے اعتراف کرنے کے ساتھ ہی اُسے دھمکایا۔

''صرف ایک صورت میں۔'' نایاب نے فوراً کہا۔

''کیا؟''

''اگر تم مجھے بھی اس میں شامل کرو۔ اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کے طور پر۔'' شیر دل ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے پلان آف ایکشن میں کوئی دوسرا ممبر دور دور تک نہیں تھا مگر پھر مجبوراً اُس نے نایاب کو اپنا نائب بنانے کی حامی بھر لی۔

''ایسا کیا ہے جو تم شاہین کے لئے کر سکتی ہو؟'' شیر دل نے اُس سے پوچھا۔

نایاب نے اطمینان سے کہا:

''بہت کچھ! اس کی ویب سائٹ اور ٹیکنالوجی سے متعلق سارے کام کر سکتی ہوں جو تم بھی کر سکتے ہو لیکن تم ان میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' وہ دھڑلے سے کہہ رہی تھی۔ شیر دل نے اُس کو ٹوکا نہیں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

''میں Archer ہوں تو کسی بھی مشن میں تمہیں میرے نشانے کی ضرورت پڑے گی اور میں جوڈو کی بہترین کھلاڑی ہوں۔ جتنا تمہیں جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے اُتنا ہی مجھے بھی ہے۔'' وہ بتاتی جا رہی تھی اور شیر دل سر کھجاتا سنتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ نایاب اپنے بڑے بھائی تیمور اور ماں باپ کے ساتھ اوپر والے فلور پر رہتی تھی۔ اُس کا بھائی میڈیکل کا سٹوڈنٹ تھا اور والد ایڈیشنل سیشن جج۔

شیر دل نیچے والی منزل پر اپنے ماں، باپ، دادی اور چھوٹی بہن خدیجہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کا باپ ایک بینکر تھا اور ماں ایک بیکر۔

''او کے! ٹھیک ہے مگر یہ سب راز رہے گا۔ کسی اور کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔'' شیر دل نے اُس سے کہا تھا اور اس سے پہلے کہ نایاب کوئی جواب دیتی شیر دل کو عقب سے اچانک احد کی آواز آئی۔

''تم اب مجھ سے بھی سب کچھ چھپایا کرو گے؟'' نایاب اور شیر دل جیسے کرنٹ کھا کر پلٹے تھے اور اُن کے عقب میں احد کمر پر دونوں ہاتھ رکھے بے حد غصے سے کھڑا تھا۔

احد شیر دل کا بہترین اور بچپن کا دوست تھا۔ اُس کی ماں ایک سول سرونٹ تھی اور

باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ شیر دل کی ہی کالونی میں رہتا تھا۔

''اوہ! تم چھپ کر ہماری باتیں سنتے ہو۔'' شیر دل نے اُسے ٹالنے کے لئے ناراض ہو کر کہا تھا۔

''میں کیوں چھپ کر سنوں گا میں تو ویسے ہی سب سُن سکتا ہوں۔ میرے کان اتنے باریک ہیں اور میں شاہین کا تیسرا ممبر ہوں۔'' شیر دل نے بے چارگی سے اُسے دیکھا اور کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی احد نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''دیکھو تمہیں پتہ ہے میں کک باکسنگ میں کیا کیا کر سکتا ہوں اور غلیل سے میرا نشانہ نایاب کے تیروں سے بھی زیادہ اچھا ہے اور میں دُنیا کا سب سے بہترین map reader اور سیکیورٹی کیمروں کا ماہر ہوں۔ دُنیا کا ہر کیمرہ وینڈل کر سکتا ہوں اور میرے پاس کتنے خفیہ کیمرے ہیں وہ بھی پتہ ہے تم لوگوں کو اور......''

وہ ایک سانس میں بولتا چلا گیا اور اس سے پہلے کہ بولتا ہی چلا جاتا، شیر دل نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا:

''اچھا اچھا! بس کلاس شروع ہونے والی ہے۔''

''تو پھر میں بھی آج سے ٹیم شاہین ہوں؟'' احد نے اطمینان سے اُس سے پوچھا اور شیر دل نے جھنجھلا کر اُسے دیکھتے ہوئے کہا:

''میرے پاس کوئی چوائس ہے انکار کی؟''

احد اور نایاب نے بے اختیار کہا۔ ''No۔''

شیر دل نے کندھے اُچکاتے ہوئے جیسے ہتھیار ڈالے۔ شاہین دو دنوں میں ون مین شو سے ٹیم بن گئی تھی۔

☆

''تو یوحنا جوزف ایہ ہی نام ہے نا تمہارا؟'' وہ دن بعد انہوں نے پہلا کیس لینے کے لئے یوحنا جوزف کو بلایا تھا۔ وہ پانچویں کلاس میں تھا اور چیونگم منہ میں ڈالے اس وقت ایک خالی کلاس روم میں ان تینوں کے سامنے بیٹھا ببل پھُلا رہا تھا، اور وہ تینوں بے حد بے نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی لئے اُسے گھورتے ہوئے اپنے لیپ ٹاپ یوں چلا رہے تھے جیسے پتہ نہیں وہ جوزف کے کیس کے حوالے سے کیا کیا ریسرچ کر کے بیٹھے تھے۔ شیر دل نے بالآخر اپنے لیپ ٹاپ پر نظر ڈالتے ہوئے اُس کا نام لیا تھا۔

''ہاں!'' وہ منہ سے ببل بناتے ہوئے رُکا تھا۔

''تو تمہارے گھر کے لان میں ایک درخت ہے اور تمہیں شک ہے کہ اُس پر بھوت رہتے ہیں۔''

''بھوت نہیں چڑیلیں۔'' یوحنا نے اُسے ٹوک کر تصحیح کی۔

''ایک ہی چیز ہیں۔'' شیر دل اُس کے ٹوکنے پر کچھ گڑبڑایا تھا۔

''ایک ہی چیز نہیں ہے gender کا فرق ہے۔'' یوحنا نے بڑے اطمینان سے اُسے سمجھایا۔

''اوہ اچھا! کتنی ہیں؟'' شیر دل نے احد اور نایاب کو دیکھ کر لیپ ٹاپ میں کچھ نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں خود گن سکتا تو آپ لوگوں کے پاس کیوں آتا؟'' یوحنا نے تیکھے انداز میں کہا۔

''Valid point...... اچھا درخت کتنا پرانا ہے؟'' شیر دل نے اعترافی انداز میں اُس کی بات تسلیم کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے پہلے کہ میں تم لوگوں کے کسی اور سوال کا جواب دوں پہلے تم لوگ میرے سوالوں کا جواب دو۔'' یوحنا نے منہ سے چیونگم نکال کر ایک ٹشو میں لپیٹی تھی۔

''یہ شاہین ہے کیا؟''

''تم نے ویب سائٹ دیکھی ہے؟'' شیر دل نے پوچھا۔

''ہاں!''

''تو پھر یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟'' یوحنا سر کھجا کر بولا۔

''تو مجھے اب فیس دینی ہے؟'' شیر دل ایکسائٹڈ ہوا۔

''ہاں۔''

''پر میں تم کو کیوں دوں؟ تم شاہین تو نہیں ہو۔'' یوحنا نے یک دم کہا۔

''ہم اُن کے نمائندے ہیں۔'' احد درمیان میں کودا تھا۔

''ہم ہیپر ورک کریں گے اُن کے لئے۔'' یوحنا نے احد کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے ہیپر ورک کے لئے بچے رکھے ہوئے ہیں؟'' اُس نے بچے پر اس طرح زور دے کر کہا تھا کہ وہ تینوں تپ گئے تھے۔

''تم خود کیا ہو؟'' نایاب نے سُلگ کر اس سے پوچھا تو یوحنا گڑبڑایا:

''میں ایک ummm......''

"بچے ہو اور ہم سے زیادہ بچے ہو۔ تم فائیو میں ہو ہم سکس میں، تو ہم تم سے بہت بڑے ہیں، سمجھے فیس دکھاؤ!" نایاب نے اُس کی بات کاٹ کر اُس کو ڈانٹتے ہوئے کہا اور یوحنا نے فرمانبرداری سے فیس کا لفافہ نکال کر اُن کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ شیر دل نے لفافہ کھول کر اُس کے اندر ہی نوٹ گنے اور پھر کہا:

"50 روپے کم ہیں۔"

"اس کا لفافہ لیا تھا۔" یوحنا نے اطمینان سے کہا۔ تینوں نے بیک وقت اُسے گھورا پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر جیسے 150 روپے میں وہ کیس لینے کا فیصلہ کیا۔

......☆......

وہ اگلے دن اپنے بیگ پیک لیے سیاہ گلاسز لگائے تقریباً ایک طرح چلتے ہوئے یوحنا کے گھر پہنچے تھے جو اُن کی کالونی میں ہی ایک سڑک چھوڑ کر تھا۔

"وہ کیوں نہیں آئے؟" یوحنا نے بے حد بے تابی سے اُن تینوں کو دیکھتے ہی کہا تھا۔

"وہ آجائیں گے۔ پہلے ہم لوکیشن دیکھیں گے، فائل تیار کریں گے۔ اس کے بعد شاہین کی ٹیم آئے گی۔" شیر دل نے اُسے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

یوحنا نے ہاتھ میں پکڑی آئس کریم چاٹتے ہوئے انہیں دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر انہیں اپنے گھر کے پچھلے لان میں لے گیا جہاں ایک برگد کا بہت پرانا اور بڑا درخت تھا اور وہ درخت اتنا بڑا، اونچا اور گھنا تھا کہ اسے دیکھتے ہی اُن تینوں کی جان نکل گئی تھی۔

"تو اس درخت پر چڑیلیں ہیں تو آپ کو اُن سے کیا مسئلہ ہے؟" نایاب نے ایک نوٹ بک میں جیسے نوٹس لیتے ہوئے یوحنا سے پوچھا، جس نے بھولے سے بھی اُن سے آئس کریم کا نہیں پوچھا تھا۔

"مسئلہ تو کوئی نہیں۔" یوحنا نے سڑاپ سڑاپ کون پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"بس میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ کہاں رہتی ہیں؟"

"اگر وہ چڑیلیں آپ کو کچھ نہیں کہہ رہی تو آپ انہیں کیوں ڈسٹرب کرنا چاہتے ہیں؟" احد نے جیسے اُسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ یوحنا بھتے سے اُکھڑا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ ہمارا گھر ہے، ہمارا درخت ہے، ہماری مرضی کہ کون درخت پر رہے گا یا نہیں آپ کو کیا...... آپ نے فیس لی ہے تو بس میرا مسئلہ حل کریں۔" تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر شیر دل نے جیسے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی۔

"آپ کو کیسے پتہ کہ اس درخت پر چڑیلیں ہیں؟"

"مجھے پتہ ہے۔"

"کیسے پتہ ہے؟" شیر دل نے اصرار کیا۔ وہ سب اس وقت درخت کے بالکل نیچے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ یوحنا کچھ کہتا شیر دل کے پیروں میں ایک بڑی سی ہڈی آکر گری تھی جس پر لگا ہوا بچا کھچا گوشت یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ تازہ تازہ کھایا گیا تھا۔ شیر دل، نایاب اور احد تینوں کا رنگ بیک وقت اُس ہڈی اور اُس پر لگے ہوئے خون آلود گوشت کو دیکھ کر اڑا تھا۔

"اس طرح پتہ چلتا ہے کہ درخت پر چڑیلیں رہتی ہیں۔ ویسے یہ ہڈی کس جانور کی ہوسکتی ہے؟" یوحنا بڑے اطمینان سے اُسی طرح کون چوستے ہوئے اُن سے بولا تھا۔

شیر دل اور احد اور نایاب میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ ہڈی اُٹھا کر اُس کا تجزیہ کرتے۔ وہ دو فٹ لمبی ہڈی جیسے کسی کی ٹانگ کی ہڈی لگی تھی انہیں۔

"میرا خیال ہے کہ کوئی پرندہ......"

شیر دل نے کھنکارتے ہوئے اپنی کانپتی ہوئی آواز کو سنبھالا اور کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کوشش کے درمیان ہی درخت سے ایک اور چیز آکر اُن کے پیروں میں گری تھی۔

وہ ایک خون آلود انسانی کھوپڑی تھی۔

☆......☆......☆

اُڑن طشتری کا تجربہ

آخری قسط

محمد احمد رضا انصاری

''بھئی اس خوبصورت موسم میں سیر کرنے آیا ہوگا ٹیلوں پر۔ اس میں تاشی سے پوچھنے والی کون سی بات ہے؟'' پروفیسر صاحب ہنسے۔

تاشفین نے گہرا سانس لیا۔

''شکر ہے جان بچ گئی۔''

''پیو پیو! گرم ہو رہی ہے بوتل۔'' اسے گم صم دیکھ کر شایان بول اٹھا۔ تاشفین دوبارہ گھونٹ اندر اتارنے لگا۔

پروفیسر صاحب نے بھی میز سے ٹن اٹھایا اور ٹھنڈی یخ بوتل پینے لگے۔

تب ہی پروفیسر صاحب نے ہاتھ میں پکڑا ٹن میز پر رکھا۔ وہ لہرا کر پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''لگتا ہے انہیں چکر آ گیا۔ مسلسل کھڑے ہونے سے چکر آنے لگتے ہیں۔'' شایان نے فکر مندی سے کہا۔

پروفیسر صاحب آنکھیں موند چکے تھے۔

''انہیں کیا ہوا اچانک؟'' تاشفین گھبرا گیا۔ ساتھ ہی اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس سے قبل وہ بھی فرش پر گرتا، شایان نے آگے بڑھ کر اسے پشت سے پکڑ لیا اور دوسری کرسی پر بٹھا دیا۔

ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک نظر آئی۔ شایان نے تمسخرانہ نگاہوں سے بے ہوش پڑے پروفیسر صاحب کو دیکھا اور ہال سے نکلتا چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد عمارت میں عجیب سا شور گونجا۔ آسمان پر چمکتے آفتاب نے ایک عجب منظر دیکھا تھا۔

گول کوٹھی کی چھت کسی ڈھکن کی طرح کھلتی جا رہی تھی اور اندر ایک چمکتے رنگ کی گول اُڑن طشتری اُڑنے کو تیار کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی سے اندر بیٹھا شایان واضح نظر آتا تھا۔

چھت مکمل کھل گئی تو اُڑن طشتری گھومتی ہوئی اوپر اٹھی اور شائیں کی آوازیں نکالتی نیلے آسمان میں گم ہو گئی۔

☆

شایان کے ہال سے نکلتے ہی پروفیسر صاحب برق رفتاری سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بھاگ کر ایک الماری سے نکوئی بوتل نکالی اور ہوش و حواس سے بیگانہ پڑے تاشفین کی ناک سے لگا دی۔ چند لمحوں میں وہ کھانستا ہوا ہوش میں آ گیا۔

''مجھے کیا ہوا تھا پروفیسر صاحب؟ اور یہ شایان صدیقی کہاں چلا گیا؟ ابھی تو یہیں

کھڑا ہمارے ساتھ کولڈ ڈرنک پی رہا تھا؟'' اس کی آنکھوں میں حیرانی سی حیرانی تھی۔

''بے چارہ امتحان میں ناکام رہا۔ بھاگ گیا میری اُڑن طشتری لے کر، حالانکہ جانتا نہیں کہ اُڑن طشتری کو میں یہیں سے اپنے کنٹرول میں کر سکتا ہوں۔'' پروفیسر صاحب تلخی سے ہنسے۔

''بھاگ گیا؟ امتحان، اُڑن طشتری؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' تاشفین نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

''بیٹا! وقت بہت کم ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ! سارا قصہ بتاتا ہوں۔'' وہ ہال سے باہر بھاگے۔ تاشفین بھی تیزی سے ان کے پیچھے دوڑا تھا۔

ہال سے گزر کر وہ سیڑھیوں کے پاس آ گئے۔

پروفیسر صاحب تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دوسری منزل چھوڑ کر وہ تیسری منزل کے زینے پر آ گئے۔ اوپر لمبا چوڑا ہال تھا۔ وہاں سائنسی آلات موجود تھے اور بڑی بڑی مشینیں تھیں۔

پروفیسر صاحب ایک الماری کی طرف لپکے۔

''وہ نامراد میری قیمتی فائلیں بھی لے اڑا۔ ان میں میرے فارمولے لکھے تھے۔ اب اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''آخر ہوا کیا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی اور یہ سب کیا ہے؟ آپ نے تو کہا تھا کہ ریسرچ سینٹر ہے۔ جب کہ یہاں کی مشینری تو کوئی اور داستان سنا رہی ہے۔'' تاشفین نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ مسلسل سیڑھیاں چڑھ کر وہ بھی بھاگتے ہوئے، اس کا سانس پھول گیا تھا۔

''باتوں کا وقت بالکل نہیں ہے چھوٹے دوست۔ شایان اس سے قبل اپنے ملک پہنچے ہمیں اُڑن طشتری کو اپنے کنٹرول میں کرنا ہے۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے ہوگی۔ ادھر آؤ جلدی!'' انہوں نے تیز لہجے میں کہا اور ہال کے دوسری سمت دوڑ گئے۔ بھونچکا سا تاشفین کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر پروفیسر صاحب کے آواز دینے پر ہوش میں آیا۔

ہال کے اس طرف ایک بڑا سا کیبن بنا تھا۔ وہ بالکل کسی جہاز کے کاک پٹ جیسا تھا۔ درجنوں بٹن، لیور، دوسرے آلات، سکرینیں، بیٹھنے کے لیے دو اونچی نشستیں، ہیڈ فون مائک سب کچھ تھا۔

پروفیسر صاحب ایک کرسی پر بیٹھ کر مختلف بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگ گئے تھے۔ ان کا چہرہ وقتاً فوقتاً اتار چڑھاؤ جیسا ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سسٹم میں جان سی پڑ گئی۔ سکرینیں روشن ہوتی گئیں، مختلف لائٹس جلنے بجھنے لگیں، خودکار کمپیوٹر انگریزی زبان میں کچھ بولنے لگا۔ تاشفین برف کا مجسمہ بنا یہ گورکھ دھندہ دیکھنے لگا۔

''ادھر بیٹھ جاؤ! اور جس بٹن کو میں دبانے کا کہوں تم فوراً اسے دبا دینا یا کسی لیور کو کھینچنے کا کہوں فوراً میری بات پر عمل کرنا۔ وقت بہت کم ہے اور وہ منحوس اپنے ملک پہنچنے ہی والا ہے۔ خدا مجھے کامیاب کرے بس۔''

وہ ساتھ والی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ پروفیسر صاحب نے ایک ہیڈ فون اس کے سر پر پہنا دیا۔

تاشفین کو یوں لگا جیسے وہ کسی بوئنگ طیارے کے کاک پٹ میں بیٹھا جہاز اڑانے جا رہا ہو۔ ایک بڑی سکرین پر اُڑن طشتری نظر آنے لگ گئی تھی۔ وہ زمین کی طرف اترتی جا رہی تھی۔

پروفیسر صاحب کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ وہ جلدی جلدی کمپیوٹر کو احکامات دینے لگے ساتھ ساتھ پینل پر پھیلے مختلف بٹن پریس کرنے لگے۔

''الحمدللہ!'' کہتے ہی انہوں نے دو لیور پکڑ کر انہیں آگے کی جانب کر دیا۔

سامنے نظر آتی اُڑن طشتری نیچے جاتے جاتے اچانک اوپر کو اٹھنے لگی۔ اندر بیٹھا شایان صدیقی چونک اٹھا، وہ ہڑبڑا کر اُڑن طشتری کو نیچے اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اب اس کا کنٹرول شایان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اُڑن طشتری واپسی کا سفر طے کرنے لگی تھی۔

ادھر کیبن میں پروفیسر صاحب کے کہنے پر تاشفین مختلف لیور اور بٹن دبا کر ان کی مدد کر رہا تھا۔

''لو اب یہ آٹو کنٹرول پر لگ گئی۔ پندرہ منٹ بعد ہمارے پاس پہنچ جائے گی۔ شایان اب کچھ نہیں کر سکتا۔'' پروفیسر صاحب نے اطمینان سے گہری سانس بھری۔ انہوں نے ہیڈ فون اتار کر رکھ دیا۔ تاشفین نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

''اب بتا سکتے ہیں یہ سارا معاملہ آخر ہے کیا؟ ریسرچ سینٹر میں اُڑن طشتری کہاں سے آ گئی، شایان صدیقی اصل میں کون ہے؟ اس نے آپ کی اُڑن طشتری اور خفیہ فائلز کیوں چرائی، گاؤں والوں سے غلط بیانی کیوں کی گئی اور یہ جو ہم عرصے سے جڑی بوٹیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر آپ کو لا کر دیتے رہے کیا وہ بے مصرف ہی رہیں؟'' تاشفین کے اتنے سوالات پر وہ مسکرا کر رہ گئے۔

''ذرا ٹھہرو! میں پہلے خفیہ فورس کو اس واقعے کی اطلاع کر دوں۔ شایان کے آتے ہی اسے گرفتار بھی تو کروانا ہے نا۔'' انہوں نے ایک ٹرانسمیٹر اٹھایا اور فورس کو وہاں پہنچنے کا حکم دینے لگے۔

اس کے بعد وہ بولے:

''تاشی بیٹا! یہ کوئی ریسرچ سینٹر نہیں بلکہ ایک سرکاری تجربہ گاہ ہے۔ یہاں میں اُڑن طشتری تیار کرنے کے مشن پر آیا تھا، میری ہی فرمائش تھی کہ لیبارٹری دور دراز

علاقے میں بنائی جائے۔ حکومت نے میری یہ خواہش پوری کردی اور یہاں کے باسیوں کو دوسری کہانی بتائی گئی۔ اس عمارت کی حفاظت جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے کی جاتی ہے۔ اسی لیے کبھی مجھے سیکورٹی گارڈز کو تعینات نہیں کرنا پڑا اور ویسے بھی میں اس کے حق میں نہیں تھا۔ کم افراد کی موجودگی میں ہی میں سکون سے اپنا کام کرسکتا ہوں۔ گاؤں والوں کو بیان کی گئی کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے ہمیں وقتاً فوقتاً تم لوگوں کے ذمہ جڑی بوٹیاں تلاش کرنے کا کام لگانا پڑتا تھا۔ نیچے والی منزل کا سارا سیٹ اپ کسی ریسرچ سینٹر جیسا ہی تھا۔ جبکہ اوپر دونوں منزلوں پر مختلف مشینری و آلات نصب کیے گئے ہیں۔ شایان صدیقی کو حکومت نے میرا اسسٹنٹ مقرر کیا تھا اور مجھے دو سال پہلے اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن دس روز قبل جب میں نے اُڑن طشتری بنا کر اس کی آزمائشی پروازیں شروع کی تب ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ پڑوسی ملک کا بندہ ہے اور ہمارے ملک میں بچپن میں ہی اپنے والدین کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا اور اس کا سارا ڈیٹا ہمارے ملک سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جو دشمن ملک کے لیے کام کر رہا ہے۔ اپنے شک کی بنا پر میں نے اس پر نظر رکھنی شروع کردی تھی۔

ابھی تک حکومت کے علم میں یہ بات نہیں لائی گئی تھی کہ مجھے شایان صدیقی پر کسی بھی قسم کا شک ہو چکا ہے۔ میں اپنے طور پر پہلے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟؟'' تاشفین نے پلکیں جھپکائیں۔

''کل رات حسب معمول آخری بار میں نے اُڑن طشتری کی پرواز شروع کی۔ لیکن لینڈنگ کے وقت شایان نے میری نظر بچا کر کوئی شرارت کی اور وہ بے قابو ہو کر ٹیلوں کے درمیان گر گئی۔''

''تو اس رات جو روشنی میں نے دیکھی وہ اُڑن طشتری تھی؟'' تاشفین نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

''ہاں! پھر میں نے اُڑن طشتری کو دوبارہ اڑایا اور عمارت میں لا کر اتارا۔ اگلی صبح شایان کو ایک روبوٹ کے ساتھ باہر بھیجا کہ فٹافٹ وہ گڑھا بند کرآئے کہ کسی کو شک نہ ہو سکے۔''

''مجھے جھاڑیوں میں آہٹ سنائی دی تھی اور جب میں وہاں پہنچا تو وہ گڑھا ختم ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب وہاں شایان صدیقی کے ساتھ ایک عدد روبوٹ بھی تھا'' تاشفین کے سب سوالوں کے جوابات دھیرے دھیرے ملنا شروع ہو گئے تھے۔

''بالکل! اور جب اس نے کولڈ ڈرنک کھول کر مجھے اور تمہیں پکڑائی میں تب ہی چونک گیا تھا کہ آج کوئی انہونی ہونی ہی ہے۔ شایان صدیقی نے آج تک بن مانگے مجھے پانی کا گلاس تک نہیں دیا تھا۔''

''اوہ! لیکن بوتل تو آپ نے بھی پی تھی۔ پھر آپ بے ہوش کیوں نہیں ہوئے تھے؟''

''میں روز ایسی گولی کھاتا ہوں جس سے بے ہوشی والی کوئی چیز مجھ پر اثر نہیں کرتی، یہ بات شایان صدیقی نہیں جانتا تھا ورنہ وہ مجھے قتل کر کے پھر یہاں سے نکلتا'' پروفیسر صاحب نے بتایا۔

''کیا اب یہ عمارت خالی کر دیں گے آپ؟'' تاشفین نے ایک اور سوال کیا۔

''نہیں، میں قابل اعتماد لوگوں کے ساتھ اپنے مشن پر کام کرتا رہوں گا۔ مجھے ابھی بہت ساری اُڑن طشتریاں بنانی ہیں تاکہ میرے ملک کا دفاع مضبوط ہو'' وہ کھل کر مسکرائے۔

تاشفین بھی مسکرا اٹھا۔

اتنے میں چھت خودکار طریقے سے کھلتی چلی گئی اور اُڑن طشتری گھومتی ہوئی ایک اسٹینڈ پر آ کر رک گئی۔ اسی اثنا میں عمارت کے اندر خفیہ فورس کے اہلکار بھی آ گئے۔ انہوں نے شایان صدیقی کو قابو میں کیا، بہت جلد اس کے لباس سے خفیہ فائلیں بھی مل گئیں جنہیں پروفیسر صاحب نے دوبارہ اپنی الماری میں محفوظ کر دیا اور پھر فورس والے شایان کو لے کر وہاں سے چلے گئے۔

''خس کم جہاں پاک'' تاشفین ہنسا۔

''چھوٹے دوست اب اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر لینا۔ ٹھیک ہے؟''

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے پروفیسر صاحب، میں آپ جیسا ہی محب وطن شہری ہوں۔ سمجھیں آج نہ آپ سے ملا ہوں نہ گول کوٹھی آیا تھا۔'' وہ ہنسا۔

جواباً پروفیسر صاحب بھی ہنس پڑے۔

☆......☆......☆

1۔ سیب دل کی حفاظت کرتا ہے اور خون کو جمنے نہیں دیتا۔
2۔ امرود پیٹ کو صاف کرتا ہے۔
3۔ لیموں پیٹ صاف کرتا ہے۔
4۔ آم یادداشت کو اچھا کرتا ہے۔
5۔ انگور گردے میں پتھری نہیں ہونے دیتا۔
6۔ مالٹا جسم میں بیماری کے خلاف دفاعی نظام کو بہتر کرتا ہے۔
7۔ تربوز پانی کی کمی کو پورا کرتا ہے۔
8۔ پپیتا وزن کم کرنے میں مدد کرتا ہے۔
9۔ انار جسم میں خون بڑھاتا ہے۔
10۔ کیلا کیلشیم کی کمی کو پورا کرتا ہے۔

کالا جال، سرخ مکڑا

قرۃ العین خرم ہاشمی

اس نے سر اٹھا کر تاریک آسمان کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے بڑے قدم اٹھاتا منزل کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اسے آتا دیکھ کر چھوٹے کیڑے مکوڑے اور حشرات تو چھپ جاتے تھے مگر بڑے جانور بھی اس کی سرخ آنکھوں اور سرخ زبان سے خوفزدہ رہتے۔ سیاہ رات میں آسمان پر چمکنے والے چاند اور تاروں کی وجہ سے، ہولناک جنگل کے اندھیرے میں کچھ کمی محسوس ہوئی مگر جنگل میں پھیلی پُراسرار خاموشی کے پردے میں کئی راز چھپے ہوئے تھے۔ جنگل کے ویران اور الگ تھلگ حصے میں وہ خاموشی سے اپنا کام مکمل کرنے میں مگن تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ تھوڑی دیر میں کالا جال تیار ہو گیا۔ اب انتظار تھا تو کسی بھولے بھٹکے شکار کا۔ جو اس جال میں پھنستا۔ رات تیزی سے بیت رہی تھی مگر دور دور تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ آج کی رات بھی خالی جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں میں غصہ تیر رہا تھا۔ اسی وقت پیچھے ہلکی آہٹ ہوئی تو سرخ مکڑے نے تیزی سے گردن گھمائی۔ کچھ دور ایک خرگوش لڑکھڑاتا ہوا ادھر سے اُدھر دیکھتا گھبرائے ہوئے چل رہا تھا۔ مکڑے نے گہری سانس لی۔ اسے کسی بڑے شکار کی امید تھی مگر اس وقت یہ خرگوش بھی غنیمت تھا۔ سرخ مکڑا جو درخت کی اونچائی پر چڑھا دور تک دیکھ رہا تھا اپنی بڑی بڑی ٹانگوں کے ساتھ تیزی سے نیچے اترا۔ اس سے پہلے کہ خرگوش سنبھلتا، سرخ مکڑے نے اسے اپنی ٹانگوں میں دبوچ لیا اور کالے جال کی طرف بڑھ گیا۔ خرگوش جان بچانے کے لیے پورا زور لگانے لگا مگر کالے مکڑے کی شیطانی طاقت کے سامنے وہ بے بس ہو کر رہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد کالے جال میں سرخ مکڑا خرگوش کی دعوت اڑا رہا تھا۔ سرخ مکڑے نے آج پھر جنگل کا اہم قانون توڑا تھا کہ کوئی بھی جانور کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ خاص کر کسی مجبور یا کمزور کو۔ سرخ مکڑا جنگل کے کسی قانون کو نہیں مانتا تھا۔ وہ بس اپنے خاص مقصد کے حصول میں مگن تھا۔

☆

''بادشاہ سلامت! سرخ مکڑے نے ایک معصوم اور زخمی خرگوش کو اپنا شکار بنایا، جو غلطی سے راستہ بھول کر جنگل کے اس طرف نکل گیا تھا۔'' اُلو نے اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تو شیر غصے میں آ گیا۔

''سرخ مکڑے نے جنگل کے معصوم جانوروں کا جینا حرام کر دیا۔ اسے سزا دینی ہی پڑے گی۔'' شیر دھاڑا۔

''بادشاہ سلامت! وہ کوئی عام مکڑا نہیں ہے۔ شیطانی عمل سے بنا ہے اور اسی وجہ سے طاقتور ہے۔'' لومڑی نے سنجیدگی سے کہا تو شیر نے غصے سے اسے گھورا۔

''جنگل کا بادشاہ ایک عام مکڑے سے ڈرے گا؟'' شیر نے غصے سے کہا۔

''آپ شاید بھول رہے ہیں کہ کئی سال پہلے طافو جادوگر نے جنگل کے کچھ جانوروں پر اپنا شیطانی عمل کیا تھا جس میں باقی سب تو مر گئے مگر یہ سرخ مکڑا شیطانی طاقت حاصل کر گیا اور اسی کی مدد سے طافو جادوگر نے ایک عرصہ دراز تک لوگوں کی زندگی تنگ کیے رکھی۔ اس کی موت سے یہ سلسلہ ختم تو ہو گیا مگر اب سرخ مکڑے نے اپنی شیطانی طاقت کا استعمال کرنا شروع کر دیا اور۔۔۔!'' مکڑی کہتے ہوئے ایک دم چپ ہو گئی کیونکہ شیر اٹھ کر چلتا ہوا چٹان کے آخری سرے پر گیا اور آنکھیں سکوڑ کر جنگل کے اس حصے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جہاں کالے جالے میں سرخ مکڑا رہتا تھا۔

''سرخ مکڑے نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جنگل میں امن قائم رکھے گا۔ تب ہی ہم نے اسے وہاں رہنے کی اجازت دی۔'' شیر نے سنجیدگی سے کہا تو اُلو اور لومڑی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''بادشاہ سلامت! ہمیں لگتا ہے کہ جیسے سرخ مکڑا کسی خاص مقصد کی تلاش میں ہے۔'' اُلو نے باادب لہجے میں کہا تو شیر چونک گیا۔

''میں سمجھا نہیں! کیسا مقصد؟'' شیر پلٹ کر ان دونوں کی طرف آیا۔

''کچھ واضح تو نہیں مگر اتنا عرصہ خاموشی سے گزارنے کے بعد سرخ مکڑا اچانک ایسا کیوں کرنے لگا ہے؟ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ شاید وہ اپنے کالے جال میں کسی انسان کے پھنسنے کا انتظار کر رہا ہے۔'' اُلو نے سنجیدگی سے کہا۔ شیر نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''انسان کا انتظار؟'' شیر نے دہرایا۔ لومڑی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیونکہ اس کے مالک طاقو جادوگر نے بھی سو انسانوں کی قربانی شیطان کو دے کر، خاص جادو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر ایسا نہیں ہوا اور وہ انسانوں سے مقابلے میں مارا گیا۔'' لومڑی نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر ایسا ہوا تو یہ ہمارے جنگل کی تباہی کا باعث بن جائے گا کیونکہ ہم نے آج تک کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اس لئے وہ بھی ہمارے جنگل کے باسیوں کو کچھ نہیں کہتے۔ مگر سرخ مکڑے کی اس حرکت پر انسان غصے میں آ کر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تباہی جنگل کا رخ کرے، سرخ مکڑے پر گہری نظر رکھو۔ سرخ مکڑا ایسا کوئی شیطانی قدم اٹھائے، میں اسے ختم کر دوں گا۔''

شیر نے حکم دیا تو وہ دونوں سر ہلاتے وہاں سے چلے گئے۔ اُلو نے اپنی ٹیم کے چند اُلو، سرخ مکڑے کے کالے جالے کے ارد گرد جاسوسی پر لگا دیئے، جبکہ لومڑی بھی اپنی ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے سرخ مکڑے کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے لگی تاکہ اس بار سرخ مکڑا، سزا سے بچ نہ سکے۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ سرخ مکڑیوں کی نایاب قسم اس جنگل میں موجود ہے؟'' اسد نے حیرانی سے اپنے دوست ظفر کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ وہ دونوں کئی سالوں سے نایاب جانوروں پر ریسرچ کر رہے تھے۔

''ہاں! میرے کچھ دوست، چند دن پہلے شکار کھیلنے اس جنگل میں گئے تھے، تب انہوں نے جنگل کے ویران حصے میں دیوقامت جسامت کا سرخ مکڑا دیکھا۔ سوچو اگر ہم اس سرخ مکڑے کو پکڑ کر دنیا کے سامنے لے آئیں تو ہمارا نام مشہور ہو جائے گا اور ہمیں بہت پیسہ بھی ملے گا۔''

ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں اگر یہ سچ ہوا تو ہماری قسمت بدل جائے گی۔'' اسد نے جلدی سے کہا۔

''بس پھر تیاری کرو۔ اپنے ٹیم ممبران کو تیار کر لو۔ ہم پانچ افراد کی ٹیم سرخ مکڑے کو پکڑنے جنگل کے اس حصے میں جائیں گے۔ ویسے تو مکڑے نقصان دہ نہیں ہوتے مگر چونکہ وہ جسامت میں بہت بڑا ہے تو احتیاط بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے اسے بے ہوش کرنا ہوگا۔''

ظفر نے جلدی سے سارا پلان بتاتے ہوئے کہا تو اسد نے سر ہلا دیا۔ کچھ دن تیاریاں کرنے میں لگ گئے۔ ٹھیک چار دن بعد، پانچ افراد کی ماہر ٹیم سرخ مکڑے کو پکڑنے جنگل کے ویران اور خطرناک حصے کی طرف چل پڑی۔ یہ جانے بغیر کہ ان کا سامنا کسی عام مکڑے سے نہیں بلکہ ایک شیطانی مکڑے سے ہونا تھا۔ جس کی اصل طاقت ہی انسانی خون پینے میں تھی۔ اسی کی تلاش اسے کالا جالا بننے پہ مجبور کرتی۔ اسی کالے جال میں اس نے اب تک کئی انسانوں کو قید کر کے، ان کا خون پیا تھا۔ اسے بھی اپنے آقا طاقو جادوگر کی طرح سو انسانوں کی گنتی پوری کرنی تھی۔ تب ہی وہ ہمیشہ کے لئے ناقابل شکست بن جاتا اور پھر وہ جنگل کیا، پوری دنیا پر حکومت کرتا۔

☆......☆......☆

''بادشاہ سلامت! انسانوں کی ایک ٹیم جنگل کے اسی حصے کی طرف جا رہی ہے جہاں سرخ مکڑے کا کالا جال بچھا ہوا ہے۔'' اُلو نے سب سے پہلے یہ خبر شیر تک پہنچائی تھی۔ شیر نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

''ایک ثبوت بھی ہے میرے پاس!'' لومڑی فخریہ انداز میں کہتی آگے بڑھی تو اُلو اور شیر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ لومڑی نے پیچھے کھڑے چند سپاہیوں کو اشارہ کیا تو وہ تیزی سے آگے بڑھے اور ہاتھ میں پکڑی بوسیدہ ہڈیاں شیر کے سامنے رکھ دیں۔ شیر اور اُلو حیرانی سے ان ہڈیوں کو دیکھنے لگے۔ شیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''یہ تو انسان کی ہڈیاں ہیں۔'' شیر نے کہا تو لومڑی نے سر ہلایا۔

''ایسی لاتعداد ہڈیاں کالے جالے کے نیچے گھنی جنگلی گھانس میں چھپی ہوئی ہیں۔'' لومڑی نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم ان تک کیسے پہنچی؟'' اُلو نے حیرانی سے سوال کیا۔

''جب سرخ مکڑا شکار پر گیا تو میرے کہنے پر اس کی جاسوسی پر مامور کالے کوّے ان ہڈیوں کو اٹھا کر یہاں تک لائے ہیں۔'' لومڑی نے تفصیل سے بتایا۔

''کالے کوّے کے قبیلے کے لئے انعام کا اعلان کر دو۔'' شیر نے خوش ہو کر کہا اور پھر اُلو کی طرف دیکھا۔

''اپنے سپاہیوں کو تیار ہونے کا حکم دے دو۔ اس بار شیطانی طاقت سے ہونے والی لڑائی آخری ہوگی۔''

شیر نے سخت لہجے میں کہا اور چٹان کے کونے پر کھڑے ہو کر زور سے دھاڑا۔ اس کی دھاڑ سن کر ایک لمحے کے لئے ظفر اور اسد بھی اپنی ساتھیوں سمیت ڈر گئے اور کالے جالے میں گھات لگائے بیٹھا سرخ مکڑا بھی گھبرا گیا مگر پھر مطمئن ہو کر اپنے نئے شکار کا انتظار کرنے لگا جس کی جھلک وہ کئی سو میل دور سے دیکھ چکا تھا۔ اپنے شیطانی عمل سے۔

☆......☆......☆

ان لوگوں نے ویران حصے سے کچھ دور جیپ روکی۔ جیپ کے پیچھے ایک بڑا ٹرک موجود تھا جس میں بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا ارادہ تھا کہ سرخ مکڑے کو بے ہوش کر کے پنجرے میں بند کر کے شہر لے جائیں گے۔ وہ پانچوں اپنے ہاتھ میں بندوق پکڑے اور دوسرا سامان اٹھائے محتاط انداز میں جنگل کے اس حصے کی طرف بڑھنے لگے جہاں انھوں نے سرخ مکڑے کی جھلک دیکھی تھی۔ کچھ دیر ایسے ہی چلتے رہے جب اچانک اسد کی نگاہ سرخ مکڑے کی جھلک پر پڑی اور اس نے ہلکی سی سیٹی بجا کر، ہاتھ اٹھا

کر اشارہ کیا۔ وہ سب تیزی سے اس طرف بڑھے۔ جب ظفر نے دوسری سمت سرخ ٹکڑے کی جھلک دیکھی تو وہ چونک گیا۔ اس کے تیسرے ساتھی حماد نے کسی اور سمت میں سرخ ٹکڑا دیکھا۔ اب وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''ہمارے پاس دو بے ہوش کرنے والی گنیں ہیں۔ ہم دو ٹیمیں بنا لیتے ہیں۔ اسد، حماد، اظہر اس سمت میں جائیں گے اور میں اور علی دوسری طرف۔ ہم میں سے جو پہلے کامیاب ہوا وہ سیٹی بجا کر سب کو متوجہ کرے گا۔ بیسٹ آف لک!'' ظفر نے جلدی سے کہا تو ان پانچوں نے ہاتھ ملائے اور پھر مخالف سمت میں چلے گئے۔ وہ تینوں کافی دور چلے گئے مگر انہیں سرخ ٹکڑا نظر نہیں آیا۔ وہ تینوں حیران تھے کہ سرخ ٹکڑا اب کہاں گیا؟ وہ جنگلی گھاس پر محتاط انداز میں قدم رکھتے آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر انہیں سرخ ٹکڑا نظر نہیں آیا۔

دوسری طرف ظفر اور علی تھوڑی دور گئے، جب انہیں دوبارہ سرخ ٹکڑا نظر آیا۔ وہ دونوں محتاط انداز میں چلتے آگے بڑھے۔ ایک جگہ رک کر ظفر نے درخت کی طرف اشارہ کیا تو علی نے سمجھ کر سر ہلایا۔ ظفر مہارت سے درخت پر چڑھنے لگا۔ مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے علی کو اشارہ کرنے کے لئے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو علی وہاں نہیں تھا۔ ظفر چونک گیا۔ ظفر نے جلدی سے ادھر اُدھر دیکھا۔ اچانک اسے کچھ دور کسی آدمی کے پاؤں زمین پر گھسٹتے نظر آئے جیسے کسی آدمی کو کھینچ کر کوئی لے جا رہا تھا۔ ظفر چونک گیا۔ وہ علی کے جوتے تھے۔ ظفر نے زور سے سیٹی بجائی اور درخت سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ مسلسل مخصوص انداز میں سیٹیاں بجا رہا تھا۔ اس کی سیٹی کی آواز تیزی سے جنگل کی دوسری طرف گئی جہاں باقی ٹیم ممبر تھے۔ وہ چونکے اور فوراً واپس بھاگے۔ ظفر نے خطرے کی سیٹی بجائی تھی۔ ظفر اندھا دھند بھاگنے لگا۔ اس نے کافی دور علی کو چلاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ ظفر کی طرف کر کے مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ ظفر نے بھاگنے کی رفتار تیز کرتے ہوئے، ہاتھ میں پکڑی بندوق سے فائر کیا۔ جو سرخ ٹکڑے کو لگا تو اس نے جھٹکے سے علی کو چھوڑ دیا اور تیزی سے گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔ ظفر بھاگتا ہوا علی کے پاس آیا جس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ ظفر نے فوراً اسے فرسٹ ایڈ دی۔ علی کی حالت سنبھلنے تک، باقی تینوں ٹیم ممبر بھی وہاں پہنچ گئے۔

''وہ عام ٹکڑا نہیں ہے۔ کوئی شیطانی چیز ہے۔ اس نے اپنے شکنجے میں مجھے ایسا پکڑا جیسے میں موم کی گڑیا ہوں۔'' علی نے خوفزدہ انداز میں کہا تو سب حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

''تم زیادہ ڈر گئے ہو اور!'' اسد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا جب درخت پر چھپے ٹکڑے نے اپنے لمبے ہاتھ سے اسد کو دبوچ کر اوپر کی طرف کھینچ لیا۔ سب خوف سے چیختے، سرخ ٹکڑے پر فائرنگ کرنے لگے۔ سرخ ٹکڑا ان کی گولیوں سے بچتا، درخت پر اوپر کی طرف بھاگنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اسد کو بھی اوپر کھینچ رہا تھا۔ اسی وقت تیزی سے اڑتا باز آیا اور اس نے سرخ ٹکڑے کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ سرخ ٹکڑے نے ایک جھٹکے سے اسد کو چھوڑا جو نیچے گھنی گھاس پر گرا۔ ظفر بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔

''واپس چلو! یہاں خطرہ ہے۔'' اسد چلایا تو وہ پانچوں واپس مڑے اور بھاگنے لگے۔ وہ کچھ دور گئے تھے جب انہوں نے اپنے پیچھے سرخ ٹکڑے کو تیزی سے بھاگتے دیکھا۔ سرخ ٹکڑے کو برق رفتاری سے اپنی سمت آتا دیکھ کر وہ ڈر گئے۔ سرخ ٹکڑے نے اپنے سب بازو انہیں پکڑنے کے لئے پھیلا دیے مگر اسی وقت اُلو کے حکم پر کانٹوں سے بھری سیہ کے ٹولے نے سرخ ٹکڑے پر حملہ کر دیا۔ سرخ ٹکڑا ان کے جسم کے کانٹوں سے زخمی ہو کر غصے سے چلانے لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آوازیں بہت خوفناک تھیں۔

''باقی ساتھیوں کو فوراً بلاؤ۔ ہمیں ہر حال میں انسانوں کی مدد کرنی ہے۔'' لومڑی نے حکم صادر کیا تو کچھ دیر میں جنگل کے سب جانور ان کی مدد کو پہنچ گئے۔ اسد اور ظفر نے حیرانی سے پلٹ کر سرخ ٹکڑے کا راستہ روکتے مختلف جانوروں کو دیکھا تو وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گئے۔

''یہ ہماری مدد کر رہے ہیں!'' ظفر نے حیرانی سے کہا تو اسی وقت شیر کی دھاڑ سنائی دی۔

''بے وقوف مت بنو۔ بھاگو!'' اسد نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور گاڑی تک لے گیا۔ وہ سب جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی اسٹارٹ کر کے واپس مڑے۔ سرخ ٹکڑے نے شکار اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھتے تو تیزی سے دوسری سمت کی طرف مڑا۔ مگر اسی وقت باز نے اس کی آنکھوں پر حملہ کر کے اندھا کر دیا۔ اس سے پہلے کہ سرخ ٹکڑا سنبھلتا، شیر نے اونچی چھلانگ لگائی اور ایک جھٹکے میں اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔ ہر طرف سرخ کے بجائے، کالا خون پھیل گیا۔ شیر دھاڑا۔ سب جانور مؤدب کھڑے ہو گئے۔

''اسے کالے جال سمیت جلا دو!'' شیر نے حکم دیا اور واپس اپنی کچھار کی طرف چلا گیا۔ اُلو اور لومڑی نے اپنی نگرانی میں کالے جال اور سرخ ٹکڑے کو آگ کے سپرد کر دیا۔

''بادشاہ سلامت آپ سب کے اتفاق اور کارکردگی سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ اس لئے جنگل میں تین دن جشن رہے گا۔ سب کو انعام سے نوازا جائے گا۔'' لومڑی نے اعلان کیا تو سب جانور خوشی سے ناچنے لگے۔ جنگل سے باہر نکل کر ظفر نے گہری سانس لی۔ وہ حیران تھا کہ جنگل کے سب جانور ان کی مدد کر رہے تھے مگر یہ بات اس کے ساتھی نہیں مان رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک اتفاق تھا۔

''آئندہ اس جنگل کے امن کو جو بھی خراب کرنے کی کوشش کرے گا، اس کا انجام سرخ ٹکڑے جیسا ہی ہوگا۔''

چٹان کی بلندی سے شیر نے جنگل کے ویران حصے میں تین دن سے مسلسل جلتی آگ کی طرف دیکھا۔ یہ وہی آگ تھی جو سرخ ٹکڑے کو جلانے کے لئے لگائی گئی تھی اور ابھی تک نہیں بجھی تھی کیونکہ یہ آگ شیطانی ٹکڑے اور جال کو ہمیشہ کے لئے جلا کر بھسم کر رہی تھی۔ اسی آگ سے جشن کی مشعل روشن کی گئی تھی تاکہ جنگل کے دوسرے جانور عبرت پکڑیں اور دوبارہ ایسا کرنے کا کوئی نہ سوچے اور ایک پرامن زندگی گزاریں اور دوسروں کو بھی گزارنے دیں۔ ☆☆

شاہ زیب کو لگا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے مگر ہاتھوں کی کھال میں دھنستی پلاسٹک کی رسی کی تکلیف بتاتی تھی کہ جو ہو رہا ہے حقیقت میں ہو رہا ہے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ اور اس کے دوست جیسے بے وزنی کی کیفیت میں خلا میں تیر رہے تھے یا زمین پہ تھے وہ جان نہیں پایا۔ ویسے کمرے میں مکمل خاموشی تھی، اسے اپنے آس پاس سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی، اپنی گھٹی گھٹی سانسوں کی آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

یاسر اپنی دھن میں سکول کاریڈور میں جرنلز کا ڈھیر سینے سے لگائے تیز تیز چل رہا تھا جب موڑ مڑتے ہوئے اچانک اسے گھٹی گھٹی سسکیاں سنائی دیں۔ ایک پل کو تو وہ ڈر ہی گیا۔ پھر ہمت کر کے دو قدم آگے بڑھ کے جھانکا تو دیوار سے ٹیک لگائے پانچویں جماعت کے عبداللہ کو روتے دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' یاسر کے بے ساختہ پوچھنے پر عبداللہ نے لاچاری سے اس کی طرف دیکھا۔

''بھائی لوگ!'' یاسر کو لگا، جرنلز اس کے ہاتھ سے پھسل جائیں گے۔ بھائی لوگ ان کے سکول کے کچھ بگڑے بچوں کا گینگ تھا جو شروع شروع میں اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ خانی کرتا تھا۔ ایک بات اس گینگ کے سب لڑکوں میں مشترک تھی، سب پڑھائی کے چور تھے۔ گینگ کا سرغنہ شاہ زیب، ایک سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اسے اپنے والد کی دولت اور پہنچ پہ خاصا غرور تھا جس کا مظاہرہ وہ گاہے بگاہے کرتا رہتا تھا۔ فکر کی بات یہ تھی کہ اب یہ چھیڑ خانی مذاق سے بڑھ کے بدمعاشی کی حدوں میں داخل ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کو خاص طور پر پڑھاکو بچوں سے کچھ خاص چڑ تھی اور اگر وہ غریب یا سفید پوش خاندان سے تعلق رکھتے ہوں تو پھر تو جیسے وہ ان کا ذاتی دشمن بن جاتا تھا۔ عبداللہ کے چہرے پہ سفید دھبے تھے اور اپنی عمر کے لحاظ سے اس کا قد تھوڑا چھوٹا تھا۔ اس کے والد ایک ایکسیڈنٹ میں وفات پا چکے تھا اور بیوہ ماں بڑی مشکل سے گھر چلا رہی تھی۔ ماں کی مشکلات کا خیال ہی تھا جو عبداللہ کو پڑھائی میں شدید محنت پہ اکساتا تھا اور ہمت نہیں ہارنے دیتا تھا۔ سکول کا سٹاف شاہ زیب کے باپ کی پہنچ کی وجہ سے اس کی بدتمیزیوں کو نظر انداز کرنے پہ مجبور تھا مگر بات اب بڑھتے بڑھتے چھوٹی کلاسوں کے بچوں تک پہنچ رہی تھی۔ شاہ زیب اور اس کے گروہ نے نا صرف عبداللہ کا بستہ پانی کی ٹنکی میں پھینک دیا تھا مزید یہ کہ بریک میں اس کے جوتے کے تسمے باندھ کے اسے بھاگنے پہ مجبور کیا۔ پانچویں جماعت کے تو کسی بچے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ عبداللہ کی مدد کو آتا۔ دسویں کلاس کے یاسر اور اس کے دوست اس وقت پریکٹیکل میں مصروف تھے ورنہ وہ ضرور اس جھگڑے میں کود پڑتے۔ بریک ڈیوٹی پہ مامور سر اس وقت گراؤنڈ کے دوسری طرف راؤنڈ پہ تھے۔ جب تک وہ واپس آئے عبداللہ کا منہ، سر مٹی سے بھر چکا تھا اور اس کی کاپیاں پانی کی سطح پہ تیر رہی تھی۔ ان کے لاکھ پوچھنے پہ بھی کسی نے گینگ کا نام لینے کی جرات نہ کی۔ یاسر کا دل کیا وہ شاہ زیب اور اس کے دوستوں کو ان کے کیے کی ایسی سزا

گُلّو اور سلّو بھائی کی مہم جوئی

روبینہ کبیر خان

دے کہ وہ دوبارہ کبھی ایسی جرات نہ کریں۔ ایک ہاتھ سے جزلز سنبھالے اس نے دوسرے ہاتھ سے سہارا دے کے عبداللہ کو اٹھایا۔

یاسر اس دن بہت بھاری دل کے ساتھ گھر پہنچا۔ اسے رہ رہ کے عبداللہ کی روتی صورت یاد آ رہی تھی۔ اس کے گروپ کے باقی لڑکے بھی واقعے پہ خاصے ناخوش تھے۔ امان، احمد، موسیٰ اور یاسر کا گروپ متوسط طبقے کے گھرانوں کے بچوں پہ مشتمل تھا جن کو اپنے ماں باپ کی محنت کا بے حد احساس تھا۔ بھائی لوگ گروہ کے برعکس یہ وہ بچے تھے جن کی اخلاقی تربیت پہ والدین نے بہت محنت کی تھی۔ انھیں اچھائی، برائی کا فرق پتہ تھا۔ نیکی کی ترغیب دینے اور برائی کو روکنے کی تعلیم ان کی گھٹی میں تھی، اور اب یہی خیال انھیں عبداللہ اور اس جیسے کئی دوسرے بچوں کو بچانے کی کوشش کے لیے اکسا رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ کیسے؟

گھر پہنچ کے یاسر کھانا کھائے بغیر سو گیا۔ وہ خواب میں شاہ زیب اور اس کے دوستوں کی بری طرح درگت بنا رہا تھا کہ اچانک لائٹ چلے جانے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پسینے میں شرابور وہ سستی سے وہیں پڑا اپنے خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ چھوٹے بچوں پہ ہوتے اس ظلم کو کیسے روکا جائے؟ اچانک باہر صحن سے کچھ شور شرابہ سنائی دیا۔ امی، سنی ماموں کو لیے اندر داخل ہو رہی تھیں، ان کے پیچھے پیچھے گلو بھائی اور سلو تھے۔ یاسر کے بدن میں ایکدم جیسے بجلی بھر گئی۔ مسہری سے چھلانگ مار کے اٹھنے اور باہر صحن میں جا کے ماموں سے لپٹنے میں اسے فقط پکھ ہی لمحے لگے۔ سنی ماموں نے بھی شفقت سے یاسر کو تب تک لپٹائے رکھا جب تک گلو بھائی نے کھنکھار کے اپنی موجودگی کا احساس نہ دلوایا۔

گلو بھائی ایک عجیب و غریب کردار تھے۔ پونے سات فٹ کے قریب قد اور جسیم جثے کے اندر ایک نہایت معصوم اور ڈرپوک انسان چھپا ہوا تھا۔ اوپر سے ان کی مہین آواز۔ محلے اور خاندان بھر کی مائیں ان کا نام لے کے بچوں کو ڈراتی تھیں۔ بچے ڈر بھی جاتے تھے، تب تک جب تک کہ وہ اپنا منہ نہ کھولیں۔ ان کی آواز سننے کے بعد وہی بچے ہنس ہنس کہ لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے اور سلو ان کا چھوٹا بھائی بالکل ان کا الٹ چھوٹا قد، دبلا پتلا، بات کے بجائے لات کا استعمال کرنے والا، جتنی دیر میں سامنے والا اس کے نحیف وجود کو دیکھ کے اطمینان سے بحث شروع کرتا، اتنے میں سلو صاحب اچھل کے اگلے کی ناک پہ ٹکر مار کے اسے مزا چکھا چکے ہوتے۔ گلو کو لڑنے پہ اکسانا جتنا مشکل تھا، سلو کو جھگڑے سے روکنا اتنا ہی دشوار۔

ان دونوں کے والد یاسر کے نانا جان کے پرانے خدمت گزار تھے۔ ان کے بعد اب غلام محمد عرف گلو نے وہ ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ دونوں بھائی پڑھ تو نہ پائے مگر ہنر سیکھنے میں بہت تیز رہے۔ بڑھئی کا کام ہو یا پلمبر کا، حویلی والوں کو اب کسی کام کے لیے باہر سے بندہ بلوانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی آج کل سنی ماموں فوج میں بھرتی ہو جانے کے بعد اکثر اسے پھر سے پڑھائی شروع کرنے کے بارے میں تیار کرنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے مگر ان کے کان پہ جوں تک نہ رینگتی۔ رات کو کھانے کے بعد، سنی ماموں گلو، سلو اور یاسر کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلے۔

''کیا بات ہے یار، کوئی ٹینشن ہے؟'' سنی ماموں یاسر کی رگ رگ سے واقف تھے۔ شام سے وہ یاسر کا گم صم انداز نوٹ کر رہے تھے۔ یاسر بھی جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ صبح سکول میں جو ہوا اور بھائی لوگ کے پچھلے سارے کارنامے اس نے ماموں کو سنا ڈالے۔

''یہ کونسی بڑی بات ہے، دیکھتا ہوں کون مائی کا لعل ہے جو۔'' سلو کی مار کٹائی والی رگ پھڑک اٹھی۔

''آرام سے، آرام سے۔ صبر میرے شیر! ریس شروع کرنے سے پہلے سیٹی کا انتظار کر لیا کرو۔'' سنی ماموں نے مزاحیہ انداز میں سلو کو کہا۔ یاسر بکا بکا سلو کو پھر تا دیکھ رہا تھا۔

''اندر آپا کو بھنک بھی پڑ گئی تو پہلی گاڑی سے تمہارے ساتھ مجھے بھی گاؤں بھجوا دیں گی، ماموں کسی بھی اچھے فوجی کی طرح ہر حال میں تحمل کا دامن تھامے رہتے تھے۔

''مگر ہم اس طرح چپ کر کے تو نہیں بیٹھ سکتے نا ماموں، ان کی ہمت تو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔'' یاسر نے امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ آخر وہ فوج میں اچھے عہدے پہ تھے، خود نہ سہی، اپنے کسی اعلیٰ عہدے پہ مامور افسر سے بات کر کے ان لڑکوں کا کچھ بندوبست کرتے۔

''کرتے ہیں کچھ، سوچنے دو۔'' ماموں نے پرسوچ انداز میں سامنے لگے نیم کے درخت کو دیکھتے کہا۔

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے صبح میں ساتھ چلوں گا۔ جا کے دو جھانپڑ رسید کرتے ہیں کان کے نیچے، فوراً انسان کا بچہ بن جائے گا۔'' سلو کو تو جیسے شہر آتے ہی من پسند کارروائی مل گئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صبح سے پہلے ہی بھائی لوگوں کو سبق سکھا آتا۔

''مسلو۔'' ماموں نے تنبیہاً انداز تھوڑا سخت کیا۔

''یہ تمہارا گوٹھ نہیں ہے اور وہ کوئی عام ہاری نہیں جن سے تم مار کٹائی کر لو گے اور بعد میں صلح صفائی ہو جائے گی۔ یہ شہر ہے یہاں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا پڑے گا، اور پھر وہ لڑکے بھی بچے ہیں، کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ انہیں سزا تو ملے ساتھ غلطی کا احساس بھی ہو۔'' سلو نے خفگی سے یاسر کی طرف دیکھا مگر وہ بھی کچھ کچھ ماموں سے متفق نظر آیا۔ دوسرے دن ماموں یاسر کو لینے سکول پہنچ گئے۔ سلو نے ساتھ چلنے کی بہت ضد کی مگر ماموں نے اس کی ایک نہ سنی۔ یاسر کو لینے سے پہلے انہوں نے سکول کی بلڈنگ کا اچھی طرح گھوم پھر کے ایسے جائزہ لیا جیسے امن کے زمانے میں جنگ کے میدان کی ریکی کی جاتی ہے۔ دوسرے دن چھٹی تھی، پروگرام کے مطابق احمد، موسیٰ اور امان گھر کے قریب پارک میں یاسر کا انتظار کر رہے تھے۔ یاسر سنی ماموں، گلو اور سلو کے ساتھ جب پارک پہنچے تو انھوں نے ماموں کا بڑی گرمجوشی سے

استقبال کیا۔ یاسر ان لوگوں کو ذہنی طور پہ تیار کر چکا تھا۔ وہ تینوں ویسے ہی ان بگڑے نوابوں کی حرکتوں سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے۔ گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ کے انہوں نے منصوبے کی باریکیوں پہ کام کرنا شروع کیا۔ اچھلا تو یاسر اس وقت جب ماموں نے مہم کی ڈیوٹی گلو بھائی کو تھمائی۔ سلو کا بھی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ امان، احمد اور موسیٰ تحمل سے ساری بات سن رہے تھے مگر یاسر اور سلو کو منصوبہ خاک میں ملتا دکھائی دینے لگا۔

''ماموں جی! گلو بھائی تو شاہ زیب کی ایک آواز پہ ڈھیر ہو جائیں گے، آپ یہ کر کیا رہے ہیں؟'' یاسر بوکھلا کے بولا:

''یہ ہمیں مروائیں گے، لکھ کے رکھ لو میری بات۔'' سلو جو کہ ازخود اپنے آپ کو اس مہم کا لیڈر سمجھ رہا تھا تڑپ کے بولا۔ سنی ماموں کے ساتھ اتنی جرأت سے صرف سلو ہی بات کر سکتا تھا۔

''حوصلہ رکھو تم دونوں۔ یہ کام صرف گلو ہی کر سکتا ہے۔'' ماموں کے حتمی انداز پہ یاسر اور سلو چپ تو کر گئے مگر ان کے چہروں سے پریشانی صاف ظاہر تھی۔ اس کے بعد وہ سب ماموں کی جیپ پہ ایک ڈھابے پہ جا پہنچے جہاں سکول کا چوکیدار ان کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ ماموں کی ایک دن پہلے کی کارگزاری تھی جب وہ یاسر کو لینے سکول آئے تھے۔ چوکیدار کو پہلے تو ماموں نے اچھی سی چائے پلائی پھر اس کے بیٹے کی فوج میں بطور سپاہی بھرتی کے لیے جو معلومات اسے درکار تھی، وہ دی، گرم جوشی سے ہاتھ ملا کے رخصت چاہی اور اپنے اپنے گھروں کی طرف ہو لیے۔

''اس مہم کا نام ہے آپریشن سافٹ ویئر اپڈیٹ۔'' گاڑی میں بیٹھے تمام لڑکے سوائے گلو اور سلو کے ہنسنے لگے۔ ماموں نے گلو اور سلو کے تاثرات دیکھے۔

''فیس بک نہیں استعمال کرتے تم لوگ؟'' سلو نے ایکدم ماتھے پہ ہاتھ مارا اسے کرونا کے زمانے کے پولیس کے ہاتھوں ہوئے سافٹ ویئر اپڈیٹ، یاد آ گئے تھے، وہ بھی ان سب کے ساتھ ہنسنے لگا۔ اس سے اگلے دن چھٹی کے بعد نویں جماعت کے لڑکے فٹ بال کی پریکٹس کے لیے سکول میں رکے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہونے کے بعد باقی سب لڑکے جا چکے تھے سوائے شاہ زیب اور اس کے گروہ کے۔ کافی گرمی تھی پیاس محسوس ہونے پہ انھوں نے کینٹین کا رخ کیا۔ کولڈ ڈرنک کے سیکشن میں کچھ نہیں تھا سوائے ہوم میڈ جوس کے۔ کینٹین والا نہ جانے کہاں تھا، شاہ زیب نے لاپرواہی سے بوتل اٹھائی اور منہ سے لگالی۔ جوس کا ذائقہ کچھ عجیب سا تھا، ایک گھونٹ لے کے اس نے بوتل دوست کو پکڑا دی اسی طرح سارے گینگ نے جوس کے دو دو گھونٹ لے لیے۔ ایک دم کینٹین کے پیچھے بنے سٹور روم سے میوزک کی آواز آنے لگی۔ سب نے چونک کے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تجسس کے مارے سب سے پہلے شاہ زیب نے ادھر کا رخ کیا، باقی حسب عادت اس کے پیچھے ہو لیے۔ سٹور کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے عجیب سی ست رنگی روشنی کی لکیریں باہر آ رہی تھی۔ میوزک اب شور شرابے سے ستار کی مدھر دھن میں تبدیل ہو گیا تھا۔ شاہ زیب اور اس کے ساتھیوں کے اعصاب پہ عجیب سا سکون طاری ہونے لگا۔ سٹور کے اندر وہ تقریباً ایک ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔ جب ایکدم اندھیرا ہوا، اس سے پہلے کہ وہ سمجھ پاتے سٹور کا دروازہ جیسے ہوا کے زور سے بند ہو گیا، ستار کی دھن اب عجیب سی بین کی پر اسرار آواز میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لوگوں کا گروہ جیسے کسی جادو کے زیر اثر سلو موشن میں چل رہا تھا۔ ان کو سمجھ آ بھی رہی تھی اور نہیں بھی جب سامنے سے ایک دیو ہیکل سیاہ رنگ کا پیکر دکھائی دیا۔ ان سب کے اعصاب کو دھچکا سا لگا اور شدید دہشت کے عالم میں ان کے حلق سے عجیب غوں غاں کی آوازیں نکلنی شروع ہو گئیں۔ اس دیو کے ساتھ ایک ننھا سا چھلاوا بھی تھا جو اچھل اچھل کے چل رہا تھا۔ ابھی وہ پہلے دھچکے سے نہیں سنبھلے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ان کے ہاتھ باندھ دیے۔ وہ سب چکرا کے زمین پہ گر پڑے۔ شاہ زیب کو لگا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے مگر ہاتھوں کی کھال میں دھنستی پلاسٹک کی رسی کی تکلیف بتاتی تھی کہ جو ہو رہا ہے حقیقت میں ہو رہا ہے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر منہ سے کوئی آواز نہ نکلی وہ اور اس کے دوست جیسے بے وزنی کی کیفیت میں خلا میں تیر رہے تھے یا زمین پہ تھے وہ جان نہیں پایا۔ ویسے کمرے میں مکمل خاموشی تھی، اسے اپنے آس پاس سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی، اپنی گھٹی گھٹی سانسوں کی آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ کالا سیاہ سینگوں والا دیو ان کے قریب آیا، چھلاوا اس کی کمر پہ ایسے بیٹھا تھا جیسے اس کی سواری کر رہا ہو۔ ان ہوتے دماغ کے ساتھ شاہ زیب کو لگا جیسے اس کا آخری وقت آن پہنچا ہو۔ اس نے کوئی دعا یاد کرنے کی کوشش کی، مولوی صاحب نے آیت الکرسی سکھائی تھی۔ وہ کیسے شروع ہوتی تھی؟ سیاہ دیو شاہ زیب کے کانوں کے پاس جھکا۔ اسے لگا وہ اس کی شہ رگ چبا ڈالے گا۔

''بچوں کو ڈرانے کا بہت شوق ہے تمہیں؟ اب چلو میرے ساتھ!'' شاہ زیب کے اعصاب اس سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے آخری یاد عبداللہ کی پانی پہ تیرتی کاپیوں کی تھی۔ بھائی لوگ گینگ کی کیچڑ میں لت پت تصویریں شاہ زیب کے اپنے فون میں محفوظ تھیں اس پیغام کے ساتھ کہ اگر اس نے دوبارہ کسی کو ہراساں کیا تو سوشل میڈیا پہ اس کی تصویریں وائرل ہو جائیں گی۔ اگر وہ کوشش کرتا تو معاملے کی تہہ میں جانے کا رسک لے سکتا تھا، شائد پتہ لگ بھی جاتا مگر اس سے جب بھی کسی نے پوچھا کہ اس دن ہوا کیا تھا۔ اس کے سامنے ایک کالا سیاہ دیو اور چھوٹا سا پھدکتا چھلاوا آ جاتا تھا اور اس کی زبان بند ہو جاتی تھی۔ اس واقعے کے بعد دو باتیں ہوئیں ایک تو بھائی لوگ گینگ تتر بتر ہو گیا اور دوبارہ کسی بچے پہ ہاتھ نہیں اٹھایا اور دوسری بات یہ کہ گلو اور سلو بھائی اپنی مہم جوئی کے بعد پھر کبھی ایک ساتھ شہر نہیں آئے۔ امی جان اکثر بلاتی ہیں مگر دونوں میں سے ایک آتا ہے اور وہ بھی کئی مہینوں بعد۔ ☆☆

بہت سال گزرے ایک قبیلے کے لوگ افریقہ کے پہاڑوں کے درمیان واقع ایک وادی میں خوشی خوشی رہ رہے تھے۔ اُن کے قبیلے تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ لیکن وہ راستہ کیا تھا صرف ایک تنگ گھاٹی تھی۔ اُس راستے کے دونوں جانب بڑے بڑے اور بالکل سیدھے پہاڑ کھڑے تھے۔ ایک دن ایک بہت بڑا اژدھا جو بے حد بھوکا تھا۔ رینگتا ہوا اس تنگ گھاٹی والے راستے کے نزدیک آن پہنچا۔ اُسے اپنے بہت ہی نزدیک انسانوں اور مویشیوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اُسے کئی دنوں سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ بھوکا رہنے کی وجہ سے وہ بہت ہی لاغر تھا۔ اُس نے اُس راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ جہاں سے یہ مزے دار خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے تنگ گھاٹی والے راستے سے گزرنے کی کوشش کی۔ مگر کئی دنوں تک وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوا۔ لیکن آخر کار وہ بھوک سے اتنا پتلا ہو گیا۔ کہ وہ کسی طرح یہ تنگ راستہ عبور کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ پھر اس خوفناک اژدھا نے گاؤں پہنچ کر قبیلے میں ملنے والی ہر زندہ چیز کو چٹ کر لیا۔ وہ سارے انسانوں کو نگل گیا۔ پھر گائے اور بھینسوں کی باری آئی۔ اور آخر میں کتوں اور مرغیوں کی۔ اُس کا خیال تھا کہ گاؤں میں اُس نے کسی کو نہیں چھوڑا۔

مگر گاؤں میں ایک عورت اپنے ننھے بچے کے ساتھ زندہ تھی۔ اُس نے اژدھے کو

جنگجو اور اژدھا

احمد عدنان طارق

آتا دیکھ لیا تھا۔ اژدھا اُس کی بو کیوں نہیں سونگھ سکا اُس کی وجہ یہ تھی کہ عورت نے اپنے اور بچے کے جسم پر اچھی طرح راکھ مل دی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے اپنی جھونپڑی سے نکلی اور گاؤں کے باہر ایک جھونپڑی میں منتقل ہو گئی۔ جہاں قبیلے والے اپنے بچھڑے باندھا کرتے تھے۔ اژدھے نے بھی ایک چکر اُس جھونپڑی کے نزدیک لگایا۔ لیکن اُسے صرف بچھڑوں اور راکھ کی بو آئی۔ تو وہ واپس چلا گیا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ اس وادی میں اب کھانے کو کچھ نہیں رہا۔ تو وہ گھاٹی سے بھی واپس جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ مگر جب وہ گھاٹی کے تنگ راستے سے داخل ہوا تھا تو وہ ایک نہایت لاغر اژدھا تھا مگر اب کھا کھا کر کپا بنا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ اس دفعہ تنگ راستے سے باہر نہیں جا سکا۔ بلکہ اُس کا منہ اور گردن کا تھوڑا حصہ تنگ راستے میں پھنس گیا۔ اژدھے کو اب کہیں جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کافی کچھ نگل چکا تھا اور کوئی دشمن بھی ادھر آ کر اُس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ وہیں پڑا رہا اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں چلا گیا۔

لیکن جیسے ہی اژدھا گاؤں سے باہر نکلا اور گھاٹی کے قریب پہنچا۔ بے چاری عورت نے جھونپڑی کا دروازہ کھولا۔ اُس نے اپنے اور اپنے بچے کے جسموں سے راکھ جھاڑی۔ اس راکھ کی وجہ سے اُسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ اس لیے وہ پانی پینے کے لیے نکل گیا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔ کہ کاش سب کو کھانے کے بعد اژدھا دریا کا سارا پانی بھی نہ پی گیا ہو۔ اس لیے اُس نے بچے کو جھونپڑی میں چھوڑا اور خود پانی لینے دریا کی طرف ہولی۔

لیکن جب وہ پانی لے کر واپس جھونپڑی میں پہنچی۔ تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اُس نے وہاں اپنے ننھے بچے کی جگہ ایک کڑیل جنگجو جوان کو بیٹھے دیکھا۔ اُس کے جسم پر شکاری چاقو بندھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے ہاتھ میں ڈھال تھی۔ ماں نے حیرانی سے نوجوان کو پوچھا۔

''کہ میرا بچہ کدھر ہے؟'' تو نوجوان جنگجو نے کہا: کہ وہی اُس کا بچہ ہے۔

''لیکن تم تو ابھی صرف چار دن پہلے ہی پیدا ہوئے تھے۔ ماں کو اُس کی بات کا یقین نہ آیا۔''

''تم اس بات پر دھیان دینا چھوڑ دو ماں۔ اور مجھے بتاؤ کہ قبیلے کے تمام لوگ کدھر چلے گئے؟'' نوجوان نے پوچھا تو ماں بے اختیار دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اور اُس نے اژدھے کے متعلق نوجوان کو بتایا کہ کس طرح وہ تمام انسان اور جانور نگل گیا ہے۔ نوجوان نے ماں سے پوچھا کہ اب وہ اژدھا کدھر ہے؟ تو ماں اپنے بیٹے کے ساتھ نکلی اور اژدھے کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ دونوں ایک جھونپڑی کی چھت پر چڑھ گئے۔ تو دور سے انہیں اژدھا سویا ہوا نظر آیا۔ ماں نے بیٹے کو بتایا کہ وہ تنگ گھاٹی کے نزدیک سویا ہوا ہے اور اُس کا منہ تقریباً گھاٹی میں پھنسا ہوا ہے۔ بیٹے نے ماں کو ساتھ لیا اور گھاٹی کی طرف چل دیا۔ اُس کے پاس اب تین نیزے تھے اور بہت سے تیز شکاری چاقو اور ایک ڈھال بھی۔ ماں اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اُس نے بیٹے کو سمجھایا کہ وہ تو ابھی صرف چار دن پہلے پیدا ہوا ہے۔ وہ اتنے خوفناک اژدھے کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔ مگر وہ اپنے بیٹے کو اُس کے ارادے سے باز نہ کر سکی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھا کر اژدھے کی طرف بڑھنے لگا۔ صرف دو دفعہ وہ راستے میں اپنے ہتھیاروں کو تیز کرنے کے لیے رکا۔ جب وہ اژدھے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تو اژدھے کے نتھنوں میں بھی اُس کی بو پہنچ گئی۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو جنگجو کو دیکھ کر اپنے نتھنوں سے شعلے نکالنے لگا مگر جنگجو اپنے آگے ڈھال کر کے بچ گیا۔ پھر اُس نے بڑا سا منہ کھول کر اُسے نگلنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ چھلانگ لگا کر اُس کے جبڑوں سے بچ گیا اور اُس کی گردن کے پچھلے حصے پر سوار ہو گیا۔ آپ بچوں کو معلوم ہے کہ اژدھا کھا کھا کر موٹا ہو گیا تھا اور اب اُس کا منہ تنگ گھاٹی میں پھنسا ہوا تھا۔ اس لیے وہ پیچھے منہ نہیں کر سکتا تھا۔ جنگجو نے اپنے پورے زور سے اژدھے کی گردن پر اپنے تینوں نیزوں سے ایک ایک وار کیا۔ یہ وار اتنے کاری تھے۔ کہ تیسرے نیزے کے وار سے وہ اژدھا ہلاک ہو گیا۔

اب جنگجو نے اپنے تیز دھار چاقو سنبھالے اور اژدھے کے بہت بڑے جسم کو ایک جگہ سے کاٹنا شروع کر دیا مگر تھوڑی دیر میں اژدھے کے اندر سے ایک آدمی کی آواز آئی کہ یہاں سے نہ کاٹو یہاں قبیلے کے سارے آدمی جمع ہیں۔ جنگجو نے وہاں سے کاٹنا چھوڑ کر دوسری جگہ سے کاٹنا شروع کر دیا۔ مگر ابھی وہاں بھی تھوڑا سا شگاف ہوا تھا کہ وہاں سے بھینسوں اور گائیوں کے ڈکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ مجبوراً جنگجو کو اژدھے کے جسم میں سوراخ کرنے کے لیے جگہ ڈھونڈنی پڑی۔ اُس نے نئے سرے سے اژدھے کو اور جگہ سے کاٹا۔ تو وہاں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس نے وہاں سے بھی اژدھے کو کاٹنے کا ارادہ ترک کر دیا اور چوتھی دفعہ ایک اور جگہ تلاش کی۔ مگر وہاں سے مرغوں کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ مگر جنگجو تب تک اُکتا چکا تھا۔ اُس نے مرغوں کی اذانیں نظر انداز کر دیں۔ اور انہیں کہا کہ وہ خود اپنا دفاع کریں۔ کیونکہ اژدھے کے جسم میں اب کوئی جگہ نہیں بچی تھی جہاں سے جنگجو کاٹ کر سب ہی لوگوں۔ مویشیوں وغیرہ کو باہر نکال سکتا۔ لہٰذا تمام مرغے اپنی جان بچانے کے لیے ادھر اُدھر ہو گئے۔ تب جنگجو نے اژدھے کے جسم میں ایک بڑا سوراخ کیا۔ جس میں اژدھے کے نگلے ہوئے تمام انسان مویشی۔ کتے اور مرغیاں آہستہ آہستہ برآمد ہونے لگے۔ زندہ اور بالکل ٹھیک ٹھاک۔

تمام قبیلے والوں نے متفقہ فیصلے سے لڑکے اور اُس کی ماں کو قبیلے کا سردار بنا لیا اور تمام رات وہ اژدھے کی موت پر جشن مناتے رہے۔ وہ اتنے خوش کیوں نہ ہوتے کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ وہ موت کے منہ سے نکل کر آئے ہیں۔ اُس جنگجو کی یاد میں آج بھی افریقہ کے کئی قبیلے جشن مناتے ہیں۔

☆......☆......☆

طلسماتی جزیرہ

عائشہ اطہر

چاروں بچے سر جوڑ کے بیٹھے تھے اور اس سوچ بچار میں مصروف تھے کہ چھٹیاں کہاں گزاری جائیں۔ ہر ایک کے پاس نت نئے خیالات تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کوئی بھی دوسرے کی بات سے متفق نہیں تھا۔ صرف ایک بات پر سب متفق تھے کہ کسی ایڈونچر کے لیے جانا چاہیے، مگر کس ایڈونچر پر، اس پر کوئی متفق نہیں ہو رہا تھا۔

عمر، حیدر، سعد اور عدیم ہمیشہ سے ایک ساتھ ہی رہے تھے۔ عمر اور حیدر بھائی ہیں اور سعد اور عدیم اُن کے چچا جان کے بیٹے۔ دونوں کے والد ملک کے مشہور سائنسدان ہیں۔ اپنی لیباٹری میں نت نئے تجربات کرنا اور نت نئی چیزیں ایجاد کرنا اُن کا روز کا معمول تھا۔ چاروں بچے اپنی پڑھائی کے بعد زیادہ تر لیباٹری میں ہی پائے جاتے تھے۔ اب کالج میں چھٹیاں ہو چکی تھیں اور نت نئے تجربات کر کر کے وہ سب اُکتا چکے تھے اسی لیے انھوں نے اپنے والدین سے کہیں چھٹیاں گزارنے کی اجازت چاہی جو انھیں آسانی سے مل بھی گئی۔

”افریقہ کے جنگل دیکھیں؟“ عمر بولا۔

”وہاں کیا دیکھنا ہے؟ روز تو ڈاکومنٹریز میں دیکھتے ہو۔“ عدیم نے جواب دیا۔

”مصر چلیں؟ ہم کبھی نہیں گئے، وہاں اہرام مصر دیکھیں گے۔“ سعد نے نیا آئیڈیا دیا۔

”ہم کبھی بحری سفر پر نہیں گئے۔ بحری سفر پر چلیں؟“ حیدر جو بہت دیر سے خاموش تھا بولا۔

”یس!“ عمر، عدیم اور سعد ایک ساتھ بولے۔ ”اعلیٰ آئیڈیا!“

”تو ٹھیک ہے، پھر تیاری کرتے ہیں۔ سب اپنے اپنے بیگ تیار کرلیں۔ جو جو

چیزیں ضروری سمجھتے ہو رکھ لو۔ میں پتا کرتا ہوں کہ ہم کب تک نکل سکتے ہیں۔'' حیدر ان سب میں بڑا تھا، ذمہ داری سے بولا۔

سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ سب جہاز کے عرشے پر کھڑے ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دور تک صرف پانی ہی پانی تھا۔ گہرا نیلا پانی۔

''حیدر بھائی! اتنا پانی دیکھ کر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' عدیم کانپتی آواز میں بولا۔ عدیم ان سب میں کافی ڈرپوک تھا۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے میرے بھائی، ویسے بھی پانی سے کیا ڈرنا؟ جو تمہارے کھانے اور پینے کی رفتار ہے اُس حساب سے بس پانی کو منہ لگاؤ، ابھی سمندر ختم ہو جائے گا۔'' سعد نے عدیم کی خوش خوراکی کا مذاق اُڑایا۔ عدیم ڈرپوک ہونے کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا بھی بہت شوقین تھا۔

''حیدر بھائی! یہ پھر شروع ہو گیا ہے۔'' عدیم بولا۔

''باز آ جاؤ سعد! مت تنگ کرو اُسے!'' حیدر نے وارننگ دی۔

''پاس آ جاؤ؟ نہ نہ حیدر بھائی! میں آپ کے پاس آ کر کیا کروں گا؟'' سعد نے پھر بات گھمائی۔

''یار عمر! اسے پکڑو ذرا!'' حیدر نے سعد کے پاس کھڑے عمر کو آواز لگائی۔ اب سب سعد کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور وہ کسی چھلاوے کی طرح اُن سب کو چکمہ دے کر بھاگ رہا تھا۔ آخر سب تھک کر وہیں لیٹ گئے۔ سفر کا آغاز اچھا ہو گیا تھا۔ سب خوش تھے مگر آنے والے وقت کی خبر کسی کو نہیں تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

رات کا آخری پہر تھا۔ سب گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ اچانک ہی موسم نے کروٹ لے لی تھی۔ شدید گرج چمک کے ساتھ بارش برسنے لگی تھی۔ سمندر کا مزاج بھی خراب ہونے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ بارش نے سمندر کو بھی غصہ دلا دیا ہے۔ پہلے لہروں میں ہلکی لرزش آئی اور پھر لرزش تندی میں بدلنے لگی۔ طوفانی بارش اور ہچکولے لیتے جہاز نے سب کو ہی جگا دیا۔ سب پریشانی کے عالم میں جہاز کے عرشے پر کھڑے کبھی شدید برستی بارش کو دیکھ رہے تھے اور کبھی تند لہروں پر ڈولتے جہاز کو دیکھ رہے تھے۔ سب کے چہروں کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی اور موسم کے تیور بگڑتے ہی جا رہے تھے۔

''حیدر بھائی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' عدیم سہمی آواز میں بولا۔

''ہو گئے شروع اس کے ڈرامے!'' سعد بولا۔

''دونوں خاموش ہو جاؤ! کبھی معاملے کی سنگینی کو بھی سمجھا کرو۔'' حیدر نے دونوں کو ڈانٹ کر خاموش کروایا اور جانچتی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ مسافروں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔

''سعد، عدیم، عمر! فوراً سے پہلے اپنے اپنے بیگ پہن لو، جلدی!'' حیدر نے چلّا کر کہا اور دوڑ لگا دی۔

''بیگ پہنتے ہی اُس کے نیچے لگے سرخ بٹن کو دبا دو!'' بھاگتے ہوئے حیدر نے چیخ کر کہا۔ چند منٹ میں ہی طوفانی لہروں نے جہاز کو اُلٹ دیا تھا۔ صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ طوفان تباہی مچا کر گزر چکا تھا۔ تند لہریں پرسکون تھیں اور گیلی ریت پر دو لوگ اوندھے منہ پڑے تھے۔ سورج کی تیز روشنی اُن کے بے حس و حرکت وجود پر پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ چبھتی روشنی اُن کے ہوش میں آنے کی وجہ بنی یا بھوک، پتا نہیں؟ لیکن چند ہی منٹ میں دونوں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔

''حیدر بھائی!'' عدیم نعرہ لگاتے ہوئے حیدر کے گلے لگ گیا۔ پھر کچھ یاد آنے پر دور ہٹا۔

''عمر، سعد! وہ ...... وہ دونوں کہاں ہیں؟'' دور دور تک ریت تھی یا درختوں کے جھنڈ۔ عدیم بلند آواز میں رونے لگا۔ حیدر نے آگے بڑھ کر دوبارہ اُسے گلے لگا لیا۔

''میرا دل کہتا ہے وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ تم رونا بند کرو شاباش اور چلو یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈتے ہیں۔'' حیدر نے اُس کی توجہ اس مشکل کی طرف کروائی جس میں وہ بُری طرح پھنس چکے تھے۔

''مجھے بھوک بھی لگی ہے۔'' عدیم بے بسی سے بولا۔

''چلو اُدھر دیکھتے ہیں۔'' حیدر نے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے بیگ جھاڑے جو ابھی تک اُن کی کمروں سے چپکے ہوئے تھے اور درختوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑے۔

''حیدر بھائی! عمر اور سعد کیا کر رہے ہوں گے؟ وہ ٹھیک تو ہوں گے؟'' آپس میں جتنا مرضی لڑ جھگڑ لیں مگر پیار بہت تھا اور اسی لیے عدیم کا دھیان ابھی تک اُن دونوں کی طرف تھا۔

''تمہیں بھوک لگی تھی نا؟ ذرا غور کرو ان درختوں میں سے کسی درخت پر پھل نہیں لگا۔ سب درخت ہرے بھرے ہیں مگر پھل کسی پر نہیں۔'' حیدر نے عدیم کا دھیان بٹایا۔

''ارے ہاں بھائی!'' عدیم بھی اب غور سے درختوں کو دیکھنے لگا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا اور اندھیرا بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

''میں تھک گیا بھائی! اور نہیں چل سکتا۔'' عدیم وہیں پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کھانے کے لیے کوئی پھل بھی نہیں اور مجھے اب پیاس بھی لگ رہی ہے۔'' عدیم چل چل کر اب نڈھال ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔'' حیدر بھی اُس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

بھوک اور تھکاوٹ، دونوں کی بیٹھتے ہی آنکھ لگ گئی۔ دونوں کی آنکھ ایک عجیب سی سرسراہٹ سے کھلی۔ جب اپنے ارد گرد دیکھا تو سات آٹھ جنگلی، پتوں کا لباس پہنے لمبے لمبے بال، کسی کے ہاتھ میں لمبا سا ڈنڈا اور کسی کے ہاتھ میں نیزہ، اُن کو گھیرے کھڑے تھے۔

''بھا...... ئی، ریڈ انڈین!'' عدیم گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

''منہ بند رکھو اور جیسا وہ بولیں کرتے جاؤ!'' حیدر دبی دبی آواز میں بولا۔

تب ہی ایک جنگلی نے آگے بڑھ کر نیزے کی نوک عدیم کی کمر میں چبھوئی۔

''ہائے بھائی!'' عدیم چیخا اور جنگلی اس سے بھی اونچی آواز میں چیخا۔

''جیسا کہہ رہا ہے ویسا کرو!'' حیدر نے عدیم سے کہا۔ عدیم کھڑا ہو گیا۔ دوسرے جنگلی نے اپنا نیزہ حیدر کی کمر سے لگا دیا۔ حیدر بھی دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اب ایک جنگلی حیدر اور عدیم کے آگے آگے اور باقی سب دائرے میں پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

''بھائی! کیا یہ ہمیں بھون کر کھا جائیں گے؟'' عدیم کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اسی لمحے جنگلی نے اپنے نیزے سے عدیم کو دھکا دیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ خاموش رہو۔

چلتے چلتے آخر کار وہ ایک جھونپڑی کے باہر پہنچ گئے جہاں پہلے سے ہی دو جنگلی جھونپڑی کے دائیں بائیں کھڑے پہرہ داری کر رہے تھے۔ جھونپڑی کے دروازے کے باہر پہنچ کر ایک جنگلی نے دونوں کو اندر کی طرف دھکا دیا۔ دونوں جھونپڑی کے اندر منہ کے بل گرے۔

''میں جانتا ہوں تم بہت محبت کرتے ہو مجھ سے پر اتنی محبت کہ سیدھا میرے پیروں میں ہی لیٹ گئے۔'' آواز جانی پہچانی تھی۔ عدیم نے سر اُٹھایا تو سامنے عمر تھا اور اس کے بائیں جانب دانت نکالتا ہوا سعد۔

''اللہ کا شکر کہ تم دونوں ٹھیک ہو۔'' حیدر نے سکون بھرے انداز میں کہا۔ جنگلی زور سے چلایا اور نیزہ ہوا میں بلند کیا۔ غصے سے بولنے کی وجہ سے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی لگ رہی تھیں۔

''عدیم، یہ تمہیں کہہ رہا ہے کہ ڈانس کرو۔'' سعد ہنسی دبا کر بولا۔ اتنی پریشانی میں بھی وہ سب خوش تھے کہ وہ خیریت سے ہیں اور ایک ساتھ ہیں۔

''خاموش ہو جاؤ اور دور دور ہو کر بیٹھو!'' حیدر نے آہستہ آواز میں سمجھایا۔ چاروں دور دور ہو کر بیٹھ گئے۔ جنگلی اُن کو گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

''کیا ہم یہاں سے بچ کر نکل جائیں گے یارو!؟'' سعد نے پوچھا۔

''ہاں! بالکل بچ کر نکل جائیں گے اگر تم نے اور عدیم نے اپنا منہ بند رکھا اور ہمارے بیگ ہمارے پاس ہی رہے۔'' عمر نے جواب دیا۔

عمر کا جملہ ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ جنگلی جھونپڑی کا پردہ ہٹا کر اندر آیا اور چاروں کے بیگ اُتروا کر لے گیا۔

''زبان ہی منحوس ہے۔ لو نکل لو یہاں سے باہر!'' سعد عمر کی طرف دیکھ کر جل کر بولا۔

''تم لوگ اپنی زبانیں کم چلاؤ اور دماغ زیادہ اور اب مجھے کسی کی آواز نہیں آنی چاہیے۔'' حیدر شدید غصے اور پریشانی کے عالم میں بولا۔ تینوں ایک دم خاموش ہو گئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرنا شروع کر دیے۔

کچھ دن اسی طرح گزرے۔ انھیں کھانے میں تین ٹائم نمک والے پانی میں اُبلے ہوئے چند پتے دیے جاتے جو انھیں کسی بریانی، قورمے سے کم نہ لگتے تھے یا تھوڑی دیر کے لیے انھیں جھونپڑی سے نکالا جاتا تاکہ وہ ہاتھ منہ دھولیں یا ضروری اُمور سے فارغ ہو جائیں۔ انھوں نے حیدر کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا تھا اور بالکل مزاحمت نہیں کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک دن ایک جنگلی جھونپڑی میں داخل ہوا اور انھیں چلنے کے لیے کہا۔ چاروں خاموشی سے کھڑے ہو گئے اور اس جانب چل پڑے جدھر وہ جنگلی اُن کو لے جا رہا تھا۔ چاروں اردگرد کا محتاط نظروں سے جائزہ بھی لے رہے تھے۔ اردگرد کہیں کوئی پھل سبزی نہیں لگی تھی۔ درخت ہرے بھرے تھے، بہتی آبشاریں تھیں، جگہ جگہ سبزہ تھا مگر نہ پرندے تھے نہ جانور بس سرسبز درختوں پر سُرخ پھول بے تحاشہ تھے۔ چلتے چلتے وہ ایک اور جھونپڑی میں پہنچ گئے۔ اس بار جنگلی نے اُن میں سے کسی کو دھکا نہیں دیا تھا بلکہ آرام سے جھونپڑی کا پردہ ہٹا کر اُن کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

اندر داخل ہوتے ہی چاروں ایک دم چونکے۔ جھونپڑی میں ایک انگریز نیم دراز تھا۔ چالیس سالہ انگریز اُن سب جنگلیوں میں ایسے ہی تھا جیسے تاریکی میں روشنی بکھیرتا چاند۔ وہ اُن چاروں کو دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک اور جنگلی اندر داخل ہوا اور اُن لوگوں کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اپنی زبان میں انگریز سے باتیں کرنے لگا۔

''تم لوگ کون ہو؟ اور یہاں کیسے آئے ہو؟ 'موسا کے' پوچھ رہا ہے۔'' انگریز بولا۔

''ہمارا بحری جہاز ایک طوفان کا شکار ہو کر ڈوب گیا اور لہروں نے ہمیں یہاں اس جزیرے پر لا کر پھینک دیا۔ ہم خود یہاں نہیں آئے بلکہ مصیبت کا شکار ہو کر پہنچے ہیں۔'' حیدر بولا۔ انگریز حیدر کی بات سن کر جنگلی کو بتانے لگا۔

''اسے کہو کہ ہم ان کے فائدے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔'' حیدر مزید بولا۔

''کیا کر سکتے ہو؟'' انگریز نے پوچھا۔

''یہ ہم تم لوگوں کو نہیں بتائیں گے۔ پہلے ہمیں اپنے سردار سے ملواؤ پھر ہی کچھ بتائیں گے۔'' حیدر نے بات ختم کی۔ جنگلی بڑبڑاتا نیزہ ہوا میں لہراتا چلا گیا۔

''آپ یہاں کب سے ہیں؟'' سعد کہاں چپ رہنے والا تھا۔

''پچھلے بیس سال سے۔ باہر جانے کا راستہ صرف سردار جانتا ہے اور وہ کسی کو نہیں بتاتا۔ اس کا خیال ہے کہ نہ باہر کی دنیا اچھی ہے اور نہ باہر کے لوگ۔'' انگریز افسردگی سے بولا۔

''میں نے یہاں ایک کشتی بھی بنائی ہے۔ اگر ان لوگوں نے تمہیں باہر نکلنے کی اجازت دی تو دکھاؤں گا۔'' انگریز پُرجوش انداز میں بولا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' عدیم نے کام کا سوال پوچھا۔

''میرا نام جیمز ہے۔''

''کیا ہم آپ کو جمی انکل کہہ سکتے ہیں؟'' سعد بولا۔

''تم یہاں بھی رشتے دار بنا لو۔ اس جنگلی کو بھی ''جنگلو انکل'' کہہ کر بلاؤ۔'' عدیم نجانے کیوں تڑپ کر بولا۔

''کیوں نہیں؟ مجھے بیس سال سے کبھی کسی نے نام لے کر نہیں پکارا۔'' جیمز افسردہ تھا۔

''آپ فکر نہ کریں جمی انکل! بہت جلد ہم اپنی دنیا میں واپس بھی جائیں گے اور آپ کو بہت سے لوگ آپ کے نام سے بھی پکاریں گے۔'' حیدر نے آگے بڑھ کر اُن کو گلے لگایا۔ اسی وقت وہی جنگلی اندر داخل ہوا اور کچھ بولا۔

''سردار بلا رہا ہے۔'' جمی انکل بولے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سردار کے سامنے کھڑے تھے۔

''ہمارا کیا فائدہ کر سکتے ہو؟'' ایک سو پچیس سالہ سردار سوال کر رہا تھا جس کا ترجمہ جمی انکل کر رہے تھے۔

''یہاں نہ پھل ہیں، نہ پرندے ہیں، نہ سبزیاں، نہ دالیں ہیں۔ ہم یہاں یہ سب اُگا سکتے ہیں۔ آپ کی اور آپ کے لوگوں کی زندگی کو بہت بہتر بنا سکتے ہیں۔ دنیا اور دنیا کے لوگ برے نہیں ہیں۔'' حیدر بے حد متانت اور سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

''تم ہمیں دھوکہ نہ دو۔ صدیوں سے یہاں کچھ نہیں اُگا، نہ اُگ سکتا ہے۔'' جمی انکل سردار کا حرف حرف دہرا رہے تھے۔

''ہم سے ڈیل کر لو۔ اگر ہم یہاں سب اُگانے میں کامیاب ہو گئے تو تم نا صرف ہم پانچوں کو آزاد کر دو گے بلکہ باہر جانے کا راستہ بھی بتاؤ گے اور اگر ہم یہ کام نہ کر سکے تو تم جو چاہو ہمیں سزا دے سکتے ہو۔ بس تمھیں ہمارے بیگ لوٹانے ہوں گے۔'' حیدر بولا۔

سردار نے غور سے اُن چاروں کو دیکھا، کچھ سوچا اور کھڑے ہو کر حیدر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ حیدر نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور بولا ''ڈیل''۔ سردار بولا ''ڈیل'' اور سب نے ''یاہو'' کا نعرہ لگایا۔

اگلی صبح خوشگوار تھی۔ اُن کے بیگ اُن کو واپس مل چکے تھے۔

''یار! کوئی شرٹ تو دو۔'' سعد عمر اور عدیم سے مخاطب تھا۔

''تمہارے اپنے کپڑے کہاں ہے؟''

''میں تو نہیں لایا۔'' معصومیت کی انتہا تھی۔

''اور کوئی ٹوتھ برش بھی دے دو۔'' سعد نے دھماکہ کیا۔

''مطلب ٹوتھ برش بھی تم ہمارے لو گے؟'' عمر غصے میں بولا۔

''میرے بیگ میں سب کی رہائی کا پروانہ ہے، یاد رکھنا'' سعد نے اپنی اہمیت جتائی۔

''دفع ہی ہو جاؤ! لے لو ٹوتھ برش، میں نہیں کرتا تم کرلو!'' عمر نے برش تھمایا۔

''اپنے تماشے بند کرو اور کام کی طرف آؤ۔ سعد! کھولو اپنا بیگ، کیا کیا لائے ہو؟'' حیدر سنجیدگی سے بولا۔ جمی انکل اُن کی نوک جھونک پر مسکرا رہے تھے۔

''بھائی! بیگ پر لگے سرخ بٹن نہ دباتے تو یہ بیگ اتنے طوفان میں بھی ہمارے ساتھ چپکے نہ رہتے۔'' عدیم حیدر سے کہہ رہا تھا۔

سب مختلف جگہوں سے کھدائی کر رہے تھے۔ حیدر، عدیم، عمر، سعد، جمی انکل اور اُن کے اردگرد کھڑے جنگلی حیرت اور بے یقینی سے انھیں دیکھ رہے تھے۔

''نکالو وہ بیج جو بابا اور چچا جان کی اَن تھک سالوں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔'' حیدر بولا۔

سعد نے اپنے بیگ میں ایک ڈبے سے مختلف طرح کے بیج نکالے اور کھدی ہوئی جگہوں پر ڈالنے شروع کیے۔ سعد بیج ڈالتا، عمر جلدی سے مٹی برابر کرتا، عدیم بوتل سے پانی جیسا کوئی کیمیکل ڈالتا، جمی انکل پانی کی ایک خاص مقدار چھڑکتے اور حیدر اُس جزیرے کے لال پھولوں کی پتیوں کے ٹکڑے اُن کے اُوپر پھینکتا۔ تھوڑی ہی دیر میں کام مکمل ہو گیا۔

''سب یہاں سے ہٹ جائیں اور سورج کی پہلی کرن سے پہلے سب یہاں موجود ہوں۔'' حیدر نے اعلان کیا۔ پھر سب ایک میدان میں اکٹھے ہو گئے۔ حیدر نے کچھ دانے ہوا میں اُچھالے۔ دانے ہوا میں دور تک ایسے بلند ہوئے جیسے انھیں کسی چیز میں رکھ کر پھینکا گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد پرندے نجانے آسمان پر کیسے اُڑتے ہوئے آ گئے۔ دانے جیسے ہی زمین پر گرے وہ دانے کھانے لگے۔ جزیرے پر صدیوں بعد پرندے نظر آئے تھے۔ جنگلی حیرت اور خوشی کے مارے کبھی پرندوں کو دیکھتے اور کبھی ان لوگوں کو۔

اگلی صبح طلسماتی جزیرے کی خوبصورت ترین صبح تھی۔ سورج کی پہلی کرن زمین پر پڑ چکی تھی۔ جگہ جگہ درختوں پر پھل اور سبزیاں لدے ہوئے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کی آواز بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ سردار اور جنگلی سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''دنیا والے برے نہیں، ہم طلسماتی جزیرے کی طرف سے معافی مانگتے ہیں۔'' سردار شرمندہ تھا۔ اُن کے لیے شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ سب جمی انکل کی کشتی میں سوار تھے۔ جواہرات سے بھرا صندوق سردار نے تحفے میں دیا تھا۔ وہ جنگلی بھی اُن کی حفاظت پر مامور کیے گئے۔ جب تک وہ اپنی دنیا کی حدود میں داخل نہیں ہو جاتے اُنھیں اُن کے ساتھ رہنا تھا۔

''یار! یہ جنگلی اپنی اتنی بڑی مونچھیں مجھے گفٹ کرے گا؟'' سعد سوال کر رہا تھا۔

''ہاں مونچھیں تمھیں گفٹ کرے گا اور تحفتاً تمھیں واپس لے جائے گا۔'' حیدر بھائی نے جواب دیا۔ جمی انکل سمیت سب نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ کشتی منزل پر پہنچ چکی تھی اور وہ طلسماتی جزیرے سے خیروعافیت سے واپس لوٹ آئے تھے۔

☆......☆......☆

نظیر فاطمہ

اچھی باتیں

کھیلو کودو، جھولا جھولو
پڑھنا لکھنا کبھی نہ بھولو

پڑھتے جاؤ، لکھتے جاؤ
آگے آگے بڑھتے جاؤ

چڑھتے جاؤ نیکی کے زینے
ختم کرو تم سارے کینے

ہمسایوں سے کرو بھلائی
چھوڑو بھی تم ان کی برائی

دل کو اپنے صاف کرو تم
بدلہ نہ لو معاف کرو تم

ماں باپ کا کہنا مانو
اُن کی بات کو کبھی نہ ٹالو

لازم کر لو خود پر صفائی
چھوڑو نہ تم کبھی ستھرائی

خود بھی سیکھو، سب کو سکھاؤ
اچھی باتیں سب کو بتاؤ

رنگ ماسٹر

قسط نمبر 1

احمد نعمان شیخ

دسمبر کا آخری ہفتہ اور موسم سرما کی پہلی برف باری۔ ایک ہی رات میں سرسبز پہاڑوں نے برف کی چادر اوڑھ لی۔ ایک طرف سفید پہاڑ اور دوسری جانب گہری کھائی۔ کھائی میں سر اٹھائے بلند و بالا اداس پیڑ، جن کی ویران شاخیں بہار کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ لیکن ابھی ان کا انتظار طویل تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر تازہ و تازہ اجلی اجلی برف موجود تھی۔ صبح کے سات بج چکے تھے۔ صبح کا سہما سہما سورج اپنی نحیف کرنیں زمین پر بکھیر رہا تھا۔ نازک کرنیں زمین کو روشن تو کر رہی تھیں لیکن سردی کی شدت میں کمی کرنے سے قاصر تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں موسم سرما کی چھٹیاں تھیں، اسی لیے خلق خدا ابھی تک ہیٹر چلائے اور لحاف اوڑھے اپنے نرم و گرم بستروں میں دنیا و مافیہا سے غافل تھی۔ لیکن کچھ ہی دار سردی کو بالائے طاق رکھ کر اپنی اپنی منزل کی جانب محو تھے۔

محمد شہزاد کی سفید کرولا برق رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ سنسان سڑک پر وہ بے فکری سے گنگناتا ہوا دائیں بائیں سر ہلاتا ہوا مزے سے کار چلا رہا تھا۔ اسی اثنا میں موبائل کی میسج ٹون سنائی دی۔ اس نے ایک نظر موبائل پر ڈالی اور دوبارہ سامنے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر میسج اوپن کیا۔

نجانے کیا ہوا؟ اچانک محمد شہزاد نے اسٹیرنگ کو پوری قوت سے بائیں جانب گھما دیا۔ کار سڑک کے کنارے پر لگے ہوئے لوہے کے راڈ کو توڑتی ہوئی گہری کھائی میں جا گری اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

☆

''واٹس اپ گائیز! آپ دیکھ رہے ہیں اپنا فیورٹ یوٹیوب چینل ''میگنٹ معیز'' اور میں ہوں آپ کا دوست معیز جہانگیر۔''معیز نے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ویڈیو کا آغاز کیا۔ بولتے ہوئے اس کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ معیز بات کرتے ہوئے اکثر ہکلا جاتا تھا۔

''آج...... جیسا کہ میں نے کل آپ کو بتایا تھا، ہم سردیوں کی چھٹیاں گزارنے راول گلی میں موجود ہیں۔ اس وقت صبح کے سات بجنے والے ہیں اور سورج بھی اڑان بھرنے کو تیار ہے۔ کل موسم کی پہلی برف باری ہوئی اور ہم نے خوب مزہ کیا۔ سس۔۔۔ سس۔۔۔۔۔۔ سنو فالنگ والی ویڈیو تو آپ کل رات دیکھ چکے ہیں۔ آج ہم آپ کو برف باری کے بعد کے مناظر دکھائیں گے۔''

''آج سردی بہت زیادہ ہے۔ لگتا ہے میری قلفی جم جائے گی۔ لیکن آپ کو ان حسین مناظر سے لطف اندوز کروانا بھی ضروری ہے۔ بس میرے ساتھ رہیں۔''معیز نے کانپتے ہاتھوں سے سرخ بٹن دبایا اور ریکارڈنگ آف کر دی۔

فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد معیز نے حسب عادت کیمرہ پکڑا اور سخت سردی میں ہوٹل کے کمرے کے ٹیرس میں آ گیا۔ سورج مشرق سے اپنا دیدار کروا رہا تھا۔ معیز نے اس حسین منظر کی چند تصاویر کھینچیں اور اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں پوسٹ کرنے کے بعد ولاگ کے لیے ریکارڈنگ کرنے لگا۔ ٹیرس کے سامنے ایک ہائی وے اور اس کے

بعد آسمان کو چھوتے پہاڑ تھے۔ ان کا کمرہ کونے پر تھا اس لیے بائیں طرف گہری کھائی بھی نظر آ رہی تھی۔

ٹیرس کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ معیز نے پیچھے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

''بندو پوچھے۔۔۔۔۔۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟'' صارم ٹیرس میں قدم رکھتے ہی معیز کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

''اب یہ بات تو بندہ ہی پوچھے۔ تم بھلا کیوں پوچھ رہے ہو؟'' معیز نے لاپروائی سے کہا اور کیمرے میں کچھ دیر پہلے ریکارڈ کی گئی ویڈیو دیکھنے لگا۔

''اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ اتنی سردی میں تم ٹیرس پر کھڑے ویڈیو بناتے پھر رہے ہو۔''

''جناب! سردیوں میں تو سردی ہی ہوگی۔ پھر کس بات کا ڈر؟ اب میں دسمبر کے آخری دنوں میں راولپنڈی جیسے ٹھنڈے علاقے میں گرمی کہاں سے لاؤں؟'' معیز نے کندھے اچکا کر سوال کیا۔

''گرمی لانے کو کون کہہ رہا ہے؟ میں تو کہہ رہا ہوں کہ اتنی صبح صبح ویڈیو بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ ناشتے کی تیاری کرتے ہیں۔ آج ہمیں اگلے شہر جانا ہے۔ دو دن سے یہاں کی ویڈیوز بنا بنا کر تمہارا دل نہیں بھرا؟'' صارم نے منہ بنا کر پوچھا اور سردی کی وجہ سے وہ دونوں ہاتھوں کو رگڑنے لگا۔

''تم تو جانتے ہو میرے چھوٹے بھائی! میں سردی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ہاں تمھیں سردی بہت لگتی ہے۔ مجھ سے چھوٹے ہو نا۔'' معیز مسکرا دیا۔

''چھوٹے تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کہ کوئی آٹھ دس سال چھوٹا ہوں۔ صرف ایک منٹ چھوٹا ہوں تم سے۔۔۔۔۔۔ صرف ایک منٹ۔'' صارم نے عجیب سی شکل بنا کر کہا اور شہادت کی انگلی دکھائی۔

''فرق ایک منٹ کا ہو یا دس سال کا۔۔۔۔۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ تم بڑے بھائی کی بات مانتے ہو یا نہیں اور عزت کرتے ہو یا نہیں۔''

''یہ کس فاروق کی بات ہو رہی ہے؟'' منیب بھی آنکھیں ملتا ہوا ٹیرس میں چلا آیا۔ اس نے سرمئی رنگ کی گرم شال اوڑھی ہوئی تھی۔

''کون فاروق؟۔۔۔۔۔۔ معیز تو فرق کی تکرار کر رہا تھا۔'' صارم نے منیب کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''بھائی! کچھ تو خیال کرو۔ یہ کون سا وقت ہے تکرار کرنے کا؟'' منیب نے معیز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وقت تو خیر یہ بحث کرنے کا بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ تت۔۔۔۔۔۔ تم لوگ اندر چلو، مجھے ابھی ویڈیو بنانی ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم دونوں بھی آج کے ولاگ میں اپنی انٹری دے دو۔ پچھلی بار جب تم دونوں ویڈیو میں آئے تھے تو ایک ہی دن میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں نے ویڈیو دیکھی تھی اور دس ہزار سے زائد افراد نے لائک کیا تھا۔'' معیز بتانے لگا۔

''یعنی کہ باقی نوے ہزار نے پسند نہیں کی؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ڈس لائک شاید چھ سات سو ہوں گے۔'' معیز نے صفائی پیش کی۔

''تم جانتے ہو تمہاری ویڈیوز کے چکر میں مجھے کتنی کوفت اٹھانی پڑتی ہے۔ جہاں بھی جاؤں، بچے میرے گرد جمع ہو کر طرح طرح کے سوال پوچھنے لگتے ہیں۔ اف! میں تو پریشان ہو گیا۔'' صارم نے کہا اور قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کس بات سے تنگ آ گئے ہو؟'' منیب نے پوچھا۔

''آپ میکنٹ معیز والے معیز جہانگیر ہیں نا؟ ہم آپ کے ولاگ بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ اور میں سب کو یہی بتاتا رہتا ہوں کہ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں معیز کا جڑواں بھائی صارم ہوں۔ لیکن کوئی یقین ہی نہیں کرتا۔'' صارم نے شکوہ کیا۔

''تو تم کہہ دیا کرو کہ ہاں۔۔۔۔۔۔ میں معیز ہوں۔''

''جھوٹ کیوں بولوں؟ جھوٹ بولنا کتنی غلط بات ہے۔ گناہ ہے یہ تم نہیں جانتے کیا؟'' صارم نے معیز کو آنکھیں دکھائیں۔

''تو تم کہہ دیا کرو کہ میں سپر صارم والا صارم ہوں اور میرے چینل پر صرف دو سو سبسکرائبر ہیں۔ میں ایک ماہ میں صرف ایک معلوماتی ویڈیو بناتا ہوں اور ہمیشہ پس پردہ رہ کر صرف اپنی آواز کا جادو جگاتا ہوں۔'' معیز نے صارم کا مذاق اڑایا۔ صارم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''اس کا تو یہی حل ہے کہ آپ دونوں اکثر ایک ساتھ ویڈیو بنایا کرو، تاکہ سب دیکھنے والوں کو پتا چل جائے کہ معیز اور صارم دونوں جڑواں بھائی ہیں۔'' منیب نے حل پیش کیا۔

''اس طرح تو ایک اور مسئلہ ہو جائے گا۔ جو کوئی بھی ہمیں دیکھے گا، یہی پوچھے گا۔۔۔۔۔ ''بھائی جان! آپ معیز ہیں یا صارم؟''

''ہاں تو تم اپنی گردن کا تل دکھا دیا کرنا اور بتا دینا کہ معیز کی گردن پر کوئی تل نہیں اور میری گردن کی دائیں جانب ایک تل ہے۔'' معیز نے حل پیش کیا۔

''بڑا اچھا لگوں گا نا، لوگوں کو گردن کا تل دکھاتے ہوئے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تینوں بھائی مل کر ویڈیو بناتے ہیں۔'' معیز نے اپنا ڈی ایس ایل آر کیمرہ ٹرائی پاڈ میں سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

''تو ویڈیو یہاں ٹیرس میں بنانا ضروری ہے کیا؟ اندر کمرے میں نہیں بن سکتی؟'' صارم نے سوال اٹھایا۔

''کمرے کے اندر ایسا دل فریب نظارہ دیکھنے کو ملے گا کیا؟ سامنے دیکھو برف پوش پہاڑ، پہاڑوں کے دامن سے بہتا ہوا جھرنا اور جھرنے کے پیچھے سر اٹھائے مسکراتا ہوا سورج۔ ہمارے ایک طرف گہری کھائی اور کھائی میں کسی بادشاہ کے تاج کی طرح تناور اونچے لمبے درخت۔''معیز کسی ناول نگار کی طرح منظر کشی کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے تم ہمیں سردی میں مار کر خوش ہو جاؤ۔ بنالو اپنی ویڈیو، لیکن اس ویڈیو سے حاصل ہونے والی یوٹیوب کی ادائیگی میں سے مجھے آدھا حصہ چاہیے۔''صارم نے فرمائش کی۔

''میرے چھوٹے بھائی! آدھا کیا۔۔۔۔۔ تم سارا معاوضہ ہی رکھ لینا۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟''معیز مسکرا دیا۔

''پھر چھوٹا بھائی؟''صارم نے آنکھیں دکھائیں۔ معیز اور منیب مسکرا دیے۔ معیز نے دونوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کیا۔ کیمرہ آن کرنے کے بعد ریکارڈنگ کا بٹن دبایا۔ اور ایک بار پھر سے بات کا آغاز کیا:

''ہیلو گائز! میں نے بہت مشکل سے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو ویڈیو میں شامل ہونے کے لئے راضی کیا ہے۔ سوچا کہ ایک بار پھر سے اپنی فیملی کا تعارف کروا دوں۔''معیز نے پر جوش انداز میں بات کا آغاز کیا۔

''جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں، میں اور میرا جڑواں بھائی صارم دونوں میٹرک میں زیرِ تعلیم ہیں اور یہ ہمارا چھوٹا بھائی منیب آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ سب گھر والے کہتے ہیں کہ منیب ہم دونوں بھائیوں سے زیادہ ذہین ہے۔''معیز نے منیب کے گال کو پکڑتے ہوئے بہت پیار سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے پیار جھلک رہا تھا۔

''اب اتنا ذہین بھی نہیں ہوں میں جتنا بھی سیکھا اپنے بڑے بھائیوں اور والدین سے ہی سیکھا۔''منیب مسکرا دیا اور معیز کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''پچھلی ویڈیو میں ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمارے بابا جانی یعنی ڈاکٹر جہانگیر کامران فرانزک ایکسپرٹ اور کرائم برانچ میں سینئر انویسٹی گیٹنگ آفیسر ہیں۔ اور اکثر ہم بابا جانی کے ساتھ انویسٹی گیشن بھی کرتے ہیں۔''صارم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''اور ہماری مما جانی زینب جہانگیر ایک ہاؤس وائف ہیں، ہمیں مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلاتی ہیں اور ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں۔''منیب نے اپنی والدہ کا تعارف کروایا۔

''یہ ہے ہماری پیاری سی چھوٹی سی فیملی۔ کسی نہ کسی دن میں بابا جانی اور مما جانی کو بھی ویڈیو میں شامل کروں گا۔''معیز نے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ٹیرس کا دروازہ کھلا، ان کے والد ڈاکٹر جہانگیر نظر آئے اور اسی لمحے انھیں اپنے پیچھے سے ایک خوف ناک آواز سنائی دی۔ تینوں نے آواز کے تعاقب میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر جہانگیر کی نظریں بھی بے اختیار اسی سمت اٹھ گئیں۔ ان کے سامنے ایک ایسا منظر تھا جو اس

سے پہلے اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ تینوں کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆......☆

"مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی۔" زینب بیگم نے ڈاکٹر جہانگیر کے لیے میز پر کافی کا مگ رکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر جہانگیر نے بھاپ اڑاتی گرما گرم کافی کا مگ اٹھایا اور مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے:

"بیگم! ماشاءاللہ آپ کافی ذہین خاتون ہیں۔ پھر کون سی ایسی بات ہے جو سمجھ نہیں آرہی؟"

"آپ کرائم برانچ میں انویسٹی گیٹنگ آفیسر ہیں۔ فرانزک ڈاکٹر ہیں۔ آپ کا تو کام ہی سراغ رسانی اور لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرنا ہے۔ لیکن تینوں بچے کیوں ہر کیس میں آپ کے ساتھ ہوتے ہیں؟" زینب بیگم نے جھلاتے ہوئے پوچھا اور جہانگیر کے سامنے بیڈ پر بیٹھ کر کافی کا گھونٹ بھرا۔

"اچھا ہے نا ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے بڑے ہو کر میرے تینوں بیٹے بہترین سراغ رساں اور جنگجو بنیں گے۔ لوگ ان کی مثالیں دیا کریں گے۔" جہانگیر نے جواب دیا۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ اس طرح ان کی پڑھائی کا حرج ہوتا ہے۔" بیگم زینب نے اگلا اعتراض اٹھایا۔

"بالکل نہیں معیز نے مڈل میں بورڈ میں ٹاپ کیا۔ صارم کئی تقریری مقابلوں اور کوئز پروگراموں میں پہلی پوزیشن لے چکا ہے۔ منیب کی ذہانت کی ہر کوئی مثال دیتا ہے۔ آپ کو اور کیا چاہیے؟"

"کچھ نہیں بس مجھے ڈر سا لگا رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے مجرموں کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ غنڈوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔" زینب بیگم کی بات سن کر ڈاکٹر جہانگیر مسکرا دیے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی بیگم اکثر یہی باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔

"یہ تینوں ٹیرس پر کیا کر رہے ہیں؟" کچھ دیر بعد ڈاکٹر جہانگیر کی نظر ٹیرس پر پڑی تو بے اختیار بول اٹھے۔

"دیکھ نہیں رہے معیز کیمرہ ٹرائی پاٹ پر لگائے ویڈیو بنا رہا ہے۔ پتا نہیں اسے یہ شوق کہاں سے پیدا ہو گیا؟" زینب بیگم نے منہ بنا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں بچے جو کرتے ہیں انہیں کرنے دو۔ اسی طرح بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہاں بس کوئی بھی کام غیر شرعی اور غیر قانونی نہ ہو۔" کافی ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر جہانگیر نے مگ میز پر رکھا اور ٹیرس کی طرف بڑھنے لگے۔ جیسے ہی انھوں نے شیشے کا دروازہ کھولا ایک خوف ناک آواز سنائی دی اور وہ سامنے کا منظر دیکھ کر دھک سے رہ گئے۔

☆......☆

شفیق ایک عرصے سے راول گلی ہائی وے پر چائے کا چھوٹا سا ہوٹل چلا رہا تھا۔ اکثر اوقات ہائی وے پر سفر کرنے والی گاڑیاں اور بسیں اس کے ہوٹل کے پاس رک جاتیں اور گرما گرم چائے، کافی اور دوسرے لوازمات سے لطف اندوز ہوتیں۔ قریب ہی دو تین ہوٹل اور چند گیسٹ ہاؤس بھی تھے۔ وہاں قیام پذیر افراد جب چہل قدمی کے لیے باہر نکلتے تو شفیق ہوٹل کی چائے اور کافی سے لازمی لطف اندوز ہوتے۔ صبح کے سات بجنے والے تھے۔ شفیق ہاتھ دستانوں میں قید کیے، سر پر میرون اونی ٹوپی پہنے برف پر چلتا ہوا اپنے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ ملازم اکرم پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ اکرم نے شفیق کو دیکھ کر سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا۔

ہائی وے پر ابھی ٹریفک کی چہل پہل نہیں تھی۔ اکا دکا گاڑیاں ہی گزر رہی تھیں۔ آج صبح برف باری کے موسم میں کم ہی لوگ سفر کرتے تھے۔ شفیق اور اکرم نے چائے کا سامان باہر نکالا، ہوٹل سیٹ کیا اور اپنے پہلے گاہک کا انتظار کرنے لگے۔

جلد ہی سیاہ لباس پہنے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے ایک آدمی آیا۔ اس کے سر پر بھی سیاہ اونی ٹوپی تھی۔ گلے کے گرد سیاہ مفلر اس انداز میں لپیٹا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ اکرم کا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"ایک کپ چائے۔" سیاہ لباس والے نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے آرڈر کیا۔

"جی۔۔۔۔ بس پانچ منٹ انتظار کریں۔" شفیق نے جواب دیا۔ وہ شخص ایک طرف کھڑا ہو گیا اور موبائل نکال کر استعمال کرنے لگا۔ شفیق نے چائے کا پانی دیگچی میں ڈال کر چولہے میں آگ جلائی۔ اکرم ہوٹل کی صفائی کرنے لگا۔

ایک سفید کرولا طوفانی رفتار سے ان کے سامنے سے گزری۔ شفیق نے ایک نظر کار کی طرف دیکھا اور چائے بناتے ہوئے اکرم کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ اچانک اسے ایک خوف ناک آواز سنائی دی۔ دونوں نے اپنے بائیں طرف دیکھا۔ وہی سفید کرولا لوہے کا راڈ توڑتی ہوئی کھائی میں گر رہی تھی۔ سیاہ لباس والے کی نظر بھی بے اختیار اسی سمت اٹھ گئی۔ شفیق اور اکرم گھبرا کر بھاگے اور تیزی سے ڈھلوان اترنے لگے۔ ارد گرد موجود تین چار افراد نے بھی یہ منظر دیکھا اور وہ بھی گاڑی کی طرف بھاگے۔ کار قلابازیاں کھاتے ہوئے ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ شیشے ٹوٹ گئے، ٹائر پھٹ گئے اور بونٹ کا دروازہ اکھڑ کر دور جا گرا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ کیسے بے قابو ہو گئی؟ سامنے سے نہ تو کوئی اور گاڑی آتی نظر آئی اور نہ ہی کوئی جانور دکھا۔" شفیق نے کار کے قریب پہنچ کر حیرانی کے عالم میں کہا۔ کار کے قریب موجود سب ہی افراد کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

باقی آئندہ

برف کا پہاڑ

امان اللہ نیّر شوکت

وہ ایک تاریک رات تھی اتنی کہ اُسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ تاریکی تو تھی لیکن اس قسم کی کہ اگر ایک فٹ کے فاصلے پر کوئی آدمی کھڑا ہو تو نظر آئے۔ سردی بھی کافی تھی اور میں اپنی ہتھیلیوں کو زور زور سے مل رہا تھا۔ اچانک جہاز پر موجود ایک افسر نے ہماری توجہ ایک طرف مرکوز کروائی۔

"سامنے دائیں طرف ایک بادبانی جہاز کھڑا ہے۔"

"بادبانی جہاز! اس قسم کی تاریک رات میں ناممکن۔"

میرے ساتھ کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ پھر اس نے دائیں طرف کچھ پالیا۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔ پھر چیخ کر بولا:

"یہ بادبانی جہاز نہیں، برف کا پہاڑ ہے۔ دیکھو یہ چمک رہا ہے۔ ہمیں اس کا پہلے ہی علاج کرلینا چاہیے تھا۔" اب تو یہ ہمارے سروں پر آ کھڑا ہوا ہے۔ ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیے۔ یارب العالمین ہماری مدد فرما!"

لیکن جوں ہی اس نے دُعا کر کے اپنے ہاتھ منہ پر پھیرے۔ بھاری بھرکم جہاز ایک خوفناک آواز کے ساتھ لرزنے لگا۔ جہاز کے نچلے حصے میں موجود محافظ اوپر آئے تاکہ اصل حالات معلوم کریں۔ جہاز بُری طرح لرز رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا اگلا حصہ ڈوبنے لگا۔

"بھائیو! جہاز زیادہ دیر سمندر کی سطح پر نہیں رہے گا۔ اگر تم اپنی جانیں بچانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔"

کپتان نے بلند آواز میں پکارا۔ وہ ہمیں برف کے پہاڑ پر لے گیا۔ برف بڑی سخت اور کھردری تھی۔ ابھی ہم نے اس پر پوری طرح اپنے پاؤں نہ جمائے تھے کہ پانی کی ایک بہت بڑی تیز لہر آئی اور برف کے پہاڑ پر سے ہو کر اس تیزی سے گزری کہ ہمارے کئی ساتھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ قوی ہیکل برف کے پہاڑ کے ساتھ جہاز زور سے ٹکرایا اور وہ ڈوبنے لگا۔ اب ہمارا اُس پر کھڑے رہنا کافی حد تک ناممکن ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے کافی ساتھی سمندر میں جاگرے تھے۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے لیکن ہم بے بس تھے۔ ان کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ سخت اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اچانک کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا۔

"جمیل! تم ہو؟ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ تم بچ گئے ہو۔ یہ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"کپتان صاحب! میں ہوں سلیم۔ آپ کی تجویز بہت کارگر ثابت ہوئی۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔"

"میں بھی کھڑا ہوں لیکن میرا خیال ہے میں زیادہ دیر تک یہاں نہیں ٹھہر سکوں گا۔" بے چارے شاہد نے کہا۔ وہ برف کے پہاڑ سے نیچے لڑھک گیا تھا اور اُسے تھامے لٹک رہا تھا۔ ہم نے فوراً اُسے بازو سے پکڑ کر اوپر کھینچا۔ پھر ہم گرمی حاصل کرنے کے لیے تقریباً ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ صرف ہم چار آدمی ہی زندہ بچے ہوں۔ کافی خاموشی کے بعد میں نے کپتان سے پوچھا۔

"اب ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟ ہمیں کوشش کر کے برف کے پہاڑ پر جہاز کے کچھ ٹوٹے ہوئے تختے تلاش کرنے چاہییں۔ انہیں جوڑ کر ہم ایک کشتی بنا سکتے ہیں جس کے ذریعے نیو فاؤنڈ لینڈ یا لیبریڈر کے ساحل پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ برف کا پہاڑ خود ہی تیرتا ہُوا کنارے جا لگے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی جہاز اِدھر آئے اور ہمیں دیکھ کر اپنے ساتھ لے جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے بچنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اس وقت تو برف کا پہاڑ ہی واحد سہارا ہے جس پر ہم سوار ہیں۔"

"مجھے بھی اس سے اتفاق ہے۔" میں نے لرزتے ہوئے کہا۔

ہم صبح ہونے کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ جب اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تو ہماری جان میں جان آئی۔ سورج نکلنے سے پہلے مشرقی حصہ پر سنہری رنگ پھیل گیا۔ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے بادل مختلف رنگوں میں پھیل رہے تھے۔ کچھ سرخ کچھ مالٹائی رنگ کے اور کچھ گلابی رنگ کے جب کہ آسمان کا باقی حصہ بالکل نیلا تھا۔ سارا سمندر مختلف رنگوں کا عکس پیش کر رہا تھا۔ اس سارے منظر میں برف کا وہ پہاڑ جس پر ہم خوفناک سفر کر رہے تھے عجب منظر پیش کر رہا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ برف کے پہاڑ پر پُرخطر سفر کرتے ہوئے ہم سب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

"دیکھو بھئی اب ہمارا کام یہ ہے کہ جوں ہی کوئی جہاز نظر آئے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی اشارہ کریں۔"

کپتان نے کہا اور ہم نے تابعدار شاگردوں کی طرح سر جھکا کر اس کی تائید کی۔ اس مقصد کو حل کرنے کے لیے ہمیں برف کے پہاڑ کی چوٹی پر جانا تھا جس کے لیے ہمیں سخت تگ و دو کرنا پڑی۔ حدِ نظر تک ایک بھی بادبان نظر نہ آتا تھا۔ چوٹی سے جب ہم نے برف کے پہاڑ کے ارد گرد کا جائزہ لیا تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ نیچے پانی میں اس کے ساتھ بہت کچھ چمٹا ہُوا ہے۔ چنانچہ ہم فوراً نیچے اُترے اور ایک ایک کر کے تمام چیزیں اوپر کھینچ لیں۔ یہ تمام چیزیں ہمارے لیے بڑی کارآمد تھیں۔ کچھ رسّے، بادبان، لکڑی کے تختے، پلاسٹک کی بنی ہوئی ٹوکریاں جن میں پھل موجود تھے۔ لکڑی کے تختوں، بادبان اور رسّوں کی مدد سے ہم ایک چھوٹی سی کشتی بنانے کے قابل ہو گئے لیکن ہم نے محسوس کیا کہ یہ کشتی اس طوفانی سمندر میں چار آدمیوں کو نہیں بچا سکتی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ بے شمار چیزیں آ کر برف کے پہاڑ کے ساتھ چمٹتی جاتی ہیں۔ چنانچہ جب کوئی مفید چیز جوں ہی آ کر پاس رُکتی ہم فوراً اسے پکڑنے کے لیے لپکتے۔ میں نے پلاسٹک کی ایک نئی بالٹی اُٹھائی کیوں کہ ہم اس میں تازہ پانی رکھ سکتے تھے۔ ہمیں کچھ اور تختے تیرتے ہوئے مل گئے جنہیں ہم نے اپنی کشتی کو مزید بڑا کرنے کے لیے بڑی مضبوطی سے استعمال کیا۔

اُس رات ہم بڑے مزے سے سوئے کیوں کہ ہم نے اتنا کچھ جمع کر لیا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہم برف کی ٹھنڈ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ سورج طلوع ہُوا تو ہم اب بھی سمندر کے سینے پر تیر رہے تھے۔ تیسری شب ہو گئی لیکن میری آنکھ نہ لگی۔ میں مختلف خیالات میں گم تھا۔ خیالات بڑی تیزی سے میرے ذہن میں آ جا رہے تھے۔ میرا جاگنا بے سود نہ رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نے کچھ فاصلے پر سیاہ رنگ کے بادبان دیکھے جو ہوا کے رُخ کے سبب ہماری طرف ہی جھکے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے بار بار آنکھیں ملیں اور حقیقت سے قریب تر ہونے کی کوشش کی کیوں کہ میں اپنے ساتھیوں کو بلاوجہ بیدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے واقعی ایک جہاز دیکھ لیا ہے جس کا رُخ ہماری جانب ہے تو میں کپتان کے پاس گیا اور اس کا شانہ ہلایا۔

"کپتان صاحب!" میں نے شوق کی زیادتی کے سبب تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"اُٹھیے، دیکھیے تو وہ سامنے کیا ہے؟"

وہ ایک دم اُٹھ بیٹھا اور پھر بے اختیار ہو کر مجھ سے لپٹ گیا اور بغیر کچھ کہے باقی ساتھیوں کو بھی جگا دیا۔ پھر ہم سب نے مل کر زور سے آواز لگائی۔ ہم جواب کا انتظار کرنے لگے لیکن بے سود۔

"ہوا کا رُخ ہماری طرف ہے۔ وہ ہرگز ہماری آواز نہ سن سکیں گے۔ آواز لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے انہیں سمجھایا۔ سب نے اتفاق کیا۔ چنانچہ میں اپنی نیند پوری کرنے کے لیے سو گیا مگر باقی جاگتے رہے۔ مجھے ایک شور اور برف کے پہاڑ کے ہچکولوں نے بیدار کر دیا۔ میں حیران تھا کہ برف کا یہ پہاڑ کس طرح ہچکولے کھا رہا ہے۔ کپتان نے حکم دیا کہ کشتی کو سمندر میں ڈالنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں نے سوچا کہ اب ہمارا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ چنانچہ ہم بلند آواز سے کلمہ طیبہ اور درودِ ابراہیمی کا ورد کرنے لگے۔ رب العالمین کو ہم پر رحم آیا اور اس نے ہمارے دلوں سے نکلی ہوئی دعائیں، کلمہ طیبہ اور درودِ ابراہیمی کا ورد قبول فرمایا اور برف کے پہاڑ کی حرکت کو دھیما کر دیا۔ اس کے پُرسکون ہونے پر ہم نے دیکھا کہ اس کا اگلا حصہ پہلے سے زیادہ پانی میں جا چکا ہے۔ میں نے کپتان سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ برف کے پہاڑ کی تہ سے برف کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر الگ ہو گیا ہے اور جب وہ پہلی مرتبہ الگ ہو کر برف کے پہاڑ سے ٹکرایا تو شور پیدا ہُوا۔ اب یہ ٹکڑا سمندر میں تیر رہا ہو گا۔ اگر اسی طرح ایک اور ٹکڑا ٹوٹ گیا تو پھر برف کا پہاڑ یقیناً اس قدر جھک جائے گا کہ ہمارا اس پر موجود رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اگر صبح تک حالات معمول پر رہے تو ہم اس ٹکڑے کو تیرتا ہُوا دیکھ لیں گے۔ بعض اوقات ٹکڑا نیچے سے ٹوٹنے کے بجائے اوپر سے بھی ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے، لیکن ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہم پہلے ہی چوٹی پر موجود تھے اور اگر اوپر سے کوئی ٹکڑا ٹوٹا بھی تو ہمارے سر محفوظ رہیں گے۔

اس خوف نے ہمیں سونے نہ دیا۔ چنانچہ صبح کا استقبال ہم نے بوجھل آنکھوں کے

ساتھ کیا لیکن ہماری آنکھوں میں فوراً چمک آگئی جب ہم نے اسی جہاز کو اپنی آنکھوں کے سامنے پایا۔ اگرچہ وہ ہم سے بہت دور تھا لیکن اس کی موجودگی ہی ہمارا خون بڑھانے کے لیے کافی تھی۔ کپتان کے حکم کے مطابق کشتی کو سمندر میں اُتارا گیا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں عارضی چپو موجود تھے۔ ہماری رفتار ایک میل فی گھنٹہ تھی اور ہمیں کم از کم تین میل کا سفر طے کرنا تھا۔ ایک میل تک سفر کرنے کے بعد ہم نے اپنے ساتھی برف کے پہاڑ کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ رواں دواں تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سمندر ہمارے سفر کے دوران آئینے کی طرح بالکل صاف اور پُرسکون رہا۔ ہماری نگاہیں جہاز کے بادبانوں پر جمی ہوئی تھیں لیکن پھر نہ جانے کیا ہُوا۔ ہوا کا جھکڑ چلا اور ایک ایک کر کے جہاز کے دونوں بادبان پھٹ گئے۔ ہمارے دل ڈوبنے لگے، حلق خشک ہو گئے۔ منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب طبیعت قدرے سنبھلی تو میں نے کپتان سے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ دوبارہ برف کے پہاڑ کی طرف جانا چاہیے۔ وہی ہمارا محسن ہے۔ اگرچہ اب ہمارے بچنے کا امکان بہت کم رہ گیا تھا۔ پہاڑ تک جانا بھی ہمیں دشوار نظر آیا کیوں کہ ہم اس سے کافی دور نکل آئے تھے۔ ہمارے دلوں پر پھر مُردنی سی چھا گئی۔ بازوؤں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہم چپو چلا سکیں۔ لیکن اب ہمارے امتحان کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے اس عرصے میں پورے صبر سے کام لیا تھا کیوں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

رب العالمین کی شان دیکھیں کہ اس نے ہماری طرف ایک کشتی بھیجی جس میں دو آدمی سوار تھے اور جو پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے لہروں پر سوار بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اس وقت ہماری کیفیت کیا تھی۔ ہمیں یوں محسوس ہُوا جیسے نئی زندگی ملی ہے۔ چہروں پر پھولوں کی سی تازگی نمایاں ہو گئی اور ہم نے بے اختیار اپنے چپوؤں کو اوپر اُٹھا کر آنے والوں کا استقبال کیا۔ ہماری خوشی دیدنی تھی۔ ہمارے قریب آنے سے پہلے انھوں نے پانی میں چپو ڈال کر کشتی کی رفتار کو بمشکل ہلکا کیا۔ چنانچہ جب ان کی کشتی ہماری کشتی کے بالکل ساتھ آ گئی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں کھانے کے لیے بالکل تازہ پھل دیے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بڑی بے تکلفی سے پیٹ بھر کر کھالیا اور اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

مَیں سمجھتا ہوں اور میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارا جہاز برف کے پہاڑ سے ٹکرایا اور جس طرح ہمارے سامنے جہاز کا عملہ اور مسافر ہمیشہ کے لیے سمندر میں غرق ہو گئے لیکن ہم اس چیز کی وجہ سے بچ گئے جو ہمارے جہاز کے ڈوبنے کا سبب بنی ہوئی تھی اور ہم مسلسل تین دن اور تین راتیں کھلے آسمان کے نیچے بے بہا پانی کی سطح پر بے آسرا تیر رہے تھے اور وہ عظیم تر ہستی رب العالمین ہم پر رحم نہ فرماتی، ہمارے گناہوں کو نظر انداز نہ کرتی اور ہماری عبادتوں کو قبول نہ کرتی تو یقیناً آج ہم زندہ نہ ہوتے۔ ہمارا حشر بھی وہی ہوتا جو ہمارے ساتھیوں کا ہُوا۔ ☆☆

پرندے

نظیر فاطمہ

پرندے ہم سے روٹھ گئے ہیں
رشتے ان سے ٹوٹ گئے ہیں

پیڑ جب کاٹے جائیں گے
تو دور پرندے جائیں گے

پرندوں کو ہم منائیں گے
واپس انھیں بلائیں گے

ہم مل کر پیڑ لگائیں گے
ہریالی واپس لائیں گے

پرندے پھر لوٹ آئیں گے
پیڑوں پر گھر بنائیں گے

صاف ہوا میں گائیں گے
پیارے گیت سنائیں گے

محنت کشوں کے عالمی دن پر خصوصی تحریر

سیدھا راستہ

الطاف حسین

وہ بہت پریشان تھا!!!

صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ اسے پریشان ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس کے سوا وہ اور کربھی کیا سکتا تھا! آج بھی جب وہ حسب معمول ہاتھ میں فائل تھامے اور چہرے پر مایوسی لیے گھر میں داخل ہوا تو ماں کے خشک ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا:

''بیٹا! مسئلہ حل ہوا؟''

''نہیں اماں!'' اس نے افسردہ لہجے میں جواب دیا اور صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''محمود بیٹا! غم نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماں نے اسے تسلی دی۔

''جان پہچان والوں کے لیے۔'' محمود ہاتھ میں پکڑی فائل کو تکیے پر رکھتے ہوئے بولا: ''اماں! میں بھاگ دوڑ کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔''

''نہ نہ بیٹا! مایوسی کی باتیں نہیں کرتے، اللہ ناراض ہوتا ہے۔'' ماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اماں! ہر روز اُمید کی روشنی میں گھر سے نکلتا ہوں لیکن واپسی مایوسی کے اندھیرے میں ہوتی ہے۔'' محمود کے لہجے کی افسردگی کم نہیں ہوئی تھی۔

''بیٹا! تم مایوسی کی باتیں کرنے کے بجائے کوشش جاری رکھو، ایک نہ ایک دن تمھیں کامیابی ضرور ملے گی۔ تم پڑھے لکھے ہو، صحت مند ہو، خوش شکل ہو، کیا کمی ہے تم میں؟'' باہمت ماں نے مایوس بیٹے کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

''اماں! ایک کمی تو ہے نا۔'' محمود نے استفساریہ انداز میں ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟'' ماں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

''چاچے مامے کی۔'' محمود نے مختصر سا جواب دیا۔

''چاچے مامے کے چکر کو چھوڑو۔'' ماں نے چارپائی پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کھڑا ہمارے ساتھ کولڈ ڈرنک پی رہا تھا؟'' اس کی آنکھوں میں حیرانی سی حیرانی تھی۔

''بے چارہ امتحان میں ناکام رہا۔ بھاگ گیا میری اُڑن طشتری لے کر، حالانکہ جانتا نہیں کہ اُڑن طشتری کو میں یہیں سے اپنے کنٹرول میں کر سکتا ہوں۔'' پروفیسر صاحب تلخی سے ہنسے۔

''بھاگ گیا؟ امتحان، اُڑن طشتری؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' تاشفین نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

''بیٹا! وقت بہت کم ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ! سارا قصہ بتاتا ہوں۔'' وہ ہال سے باہر بھاگے۔ تاشفین بھی تیزی سے ان کے پیچھے دوڑا تھا۔

ہال سے گزر کر وہ سیڑھیوں کے پاس آگئے۔

پروفیسر صاحب تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دوسری منزل چھوڑ کر وہ تیسری منزل کے زینے پر آگئے۔ اوپر لمبا چوڑا ہال تھا۔ وہاں سائنسی آلات موجود تھے اور بڑی بڑی مشینیں تھیں۔

پروفیسر صاحب ایک الماری کی طرف لپکے۔

''وہ نامراد میری قیمتی فائلیں بھی لے اڑا۔ ان میں میرے فارمولے لکھے تھے۔ اب اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''آخر ہوا کیا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی اور یہ سب کیا ہے؟ آپ نے تو کہا تھا کہ ریسرچ سینٹر ہے۔ جب کہ یہاں کی مشینری تو کوئی اور داستان سنا رہی ہے۔'' تاشفین نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ مسلسل سیڑھیاں چڑھ کر وہ بھی بھاگتے ہوئے، اس کا سانس پھول گیا تھا۔

''باتوں کا وقت بالکل نہیں ہے چھوٹے دوست۔ شایان اس سے قبل اپنے ملک پہنچے ہمیں اُڑن طشتری کو اپنے کنٹرول میں کرنا ہے۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے ہوگی۔ ادھر آؤ جلدی!'' انہوں نے تیز لہجے میں کہا اور ہال کے دوسری سمت دوڑ گئے۔ بھونچکا سا تاشفین کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر پروفیسر صاحب کے آواز دینے پر ہوش میں آیا۔

ہال کے اس طرف ایک بڑا سا کیبن بنا تھا۔ وہ بالکل کسی جہاز کے کاک پٹ جیسا تھا۔ درجنوں بٹن، لیور، دوسرے آلات، سکرینیں، بیٹھنے کے لیے دو اونچی نشستیں، ہیڈ فون مائک سب کچھ تھا۔

پروفیسر صاحب ایک کرسی پر بیٹھ کر مختلف بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگ گئے تھے۔

ان کا چہرہ وقتاً فوقتاً عاری اتار رہیا ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سسٹم میں جان سی پڑ گئی۔ سکرینیں روشن ہوتی گئیں، مختلف لائٹس جلنے بجھنے لگی، خودکار کمپیوٹر انگریزی زبان میں کچھ بولنے لگا۔ تاشفین برف کا مجسمہ بنا یہ گورکھ دھندہ دیکھنے لگا۔

''ادھر بیٹھ جاؤ اور جس بٹن کو میں دبانے کا کہوں تم فوراً اسے دبا دینا یا کسی لیور کو کھینچنے کا کہوں فوراً میری بات پر عمل کرنا۔ وقت بہت کم ہے اور وہ منحوس اپنے ملک پہنچنے ہی والا ہے۔ خدا مجھے کامیاب کرے بس۔''

وہ ساتھ والی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ پروفیسر صاحب نے ایک ہیڈ فون اس کے سر پر پہنا دیا۔

تاشفین کو یوں لگا جیسے وہ کسی بوئنگ طیارے کے کاک پٹ میں بیٹھا جہاز اڑانے جا رہا ہو۔ ایک بڑی سکرین پر اُڑن طشتری نظر آنے لگ گئی تھی۔ وہ زمین کی طرف اترتی جا رہی تھی۔

پروفیسر صاحب کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ وہ جلدی جلدی کمپیوٹر کو احکامات دینے لگے ساتھ ساتھ پینل پر پھیلے مختلف بٹن پریس کرنے لگے۔

''الحمدللہ!'' کہتے ہی انہوں نے دو لیور پکڑ کر انہیں آگے کی جانب کر دیا۔

سامنے نظر آتی اُڑن طشتری نیچے جاتے جاتے اچانک اوپر کو اٹھنے لگی۔ اندر بیٹھا شایان صدیقی چونک اٹھا، وہ ہڑبڑا کر اُڑن طشتری کو نیچے اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اب اس کا کنٹرول شایان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اُڑن طشتری واپسی کا سفر طے کرنے لگی تھی۔

ادھر کیبن میں پروفیسر صاحب کے کہنے پر تاشفین مختلف لیور اور بٹن دبا کر ان کی مدد کر رہا تھا۔

''لو اب یہ آٹو کنٹرول پر لگ گئی۔ پندرہ منٹ بعد ہمارے پاس پہنچ جائے گی۔ شایان اب کچھ نہیں کر سکتا۔'' پروفیسر صاحب نے اطمینان سے گہری سانس بھری۔ انہوں نے ہیڈ فون اتار کر رکھ دیا۔ تاشفین نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

''اب بتا سکتے ہیں یہ سارا معاملہ آخر ہے کیا؟ ریسرچ سینٹر میں اُڑن طشتری کہاں سے آ گئی، شایان صدیقی اصل میں کون ہے؟ اس نے آپ کی اُڑن طشتری اور خفیہ فائلز کیوں چرائی، گاؤں والوں سے غلط بیانی کیوں کی گئی اور یہ جو ہم عرصے سے جڑی بوٹیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر آپ کو لا کر دیتے رہے کیا وہ بے مصرف ہی رہیں؟'' تاشفین کے اتنے سوالات پر وہ مسکرا کر رہ گئے۔

''ذرا ٹھہرو! میں پہلے خفیہ فورس کو اس واقعے کی اطلاع کر دوں۔ شایان کے آتے ہی اسے گرفتار بھی تو کروانا ہے نا۔'' انہوں نے ایک ٹرانسمیٹر اٹھایا اور فورس کو وہاں پہنچنے کا حکم دینے لگے۔

اس کے بعد وہ بولے:

''تاشی بیٹا! یہ کوئی ریسرچ سینٹر نہیں بلکہ ایک سرکاری تجربہ گاہ ہے۔ یہاں میں اُڑن طشتری تیار کرنے کے مشن پر آیا تھا، میری ہی فرمائش تھی کہ لیبارٹری دور دراز

گپوں میں مصروف نظر آرہے تھے۔ محمود قلیوں کی ٹولیوں کو بغور دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا بالآخر اسے قُلی رب نواز مل گیا۔

"بھائی رب نواز!" اس نے ایک نوجوان قُلی کے پیچھے رُک کر پکارا۔

"ارے محمود بھائی!" رب نواز نے محمود کی طرف حیرت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ یہاں کیسے؟" رب نواز محمود سے ہاتھ ملانے کے بعد خوشی سے دیوانہ ہو کر اس سے لپٹ گیا۔

"کسی کو لینے نکلا تھا۔" "لیکن اب کسی اور کو لینے آ گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ بھئی پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔" رب نواز نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے۔" محمود کہتے کہتے چُپ ہو گیا۔

"بات بعد میں سُن لوں گا، آؤ پہلے میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔" رب نواز نے جلدی سے محمود کی بات کاٹی اور اس کا ہاتھ تھام کر ایک "ٹی اسٹال" پر آ گیا۔

"چیدے استاد! دو چائے۔" رب نواز نے چائے کا کہا اور پھر محمود کی طرف مُڑتے ہوئے بولا:

"چلو جی اب بتاؤ، آپ کی وہ اصل بات کیا ہے؟"

جواب میں محمود نے اپنی داستانِ غم سنانا شروع کی۔ اس دوران چائے بھی آ گئی وہ چسکیاں لے کر چائے بھی پیتے رہے باتیں بھی کرتے رہے۔ محمود نے اپنے والد کی ناگہانی موت سے جو بات شروع کی اس کے بعد پیش آنے والے نشیب و فراز کے متعلق بتایا اور آخر میں نوکری نہ ملنے کے نتیجے میں دفتر دفتر دھکے کھانے کا ذکر کیا۔ سارا حال بیان کرنے کے دوران وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف آنے کا اصل مقصد اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے گول کر گیا۔

"اب میں تمہاری اصل بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔" رب نواز چائے کے پیسے دینے کے بعد محمود کو بازو سے پکڑ کر ایک ستون کے قریب لے آیا۔

"کیا سمجھ گئے ہو؟" محمود نے پوچھا اس کے لہجے میں بے چینی کی جھلک تھی۔

"پہلے تو آپ مجھے یہ بتاؤ کہ آپ جیسے لوگ زیادہ پڑھنے کے بعد سیٹ والی نوکری کے چکر میں کیوں پڑ جاتے ہیں؟" رب نواز قدرے غصے سے بولا۔

"یہ ہمارا حق ہے۔ ہم اسی لیے تو اتنا زیادہ پڑھتے ہیں لیکن ہماری حاصل کردہ تعلیم کے مطابق ہمیں معیاری نوکری نہیں ملتی۔ قابلیت کے مطابق جب کافی دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود مجھے معقول جاب نہ ملی تو میں نے تھک کر "جونیئر کلرک" کی آسامی کے لیے درخواست جمع کرا دی جس کی تعلیمی قابلیت میٹرک پاس مانگی گئی تھی۔ آج وہاں سے بھی مجھے منفی جواب ملا ہے۔" محمود نے شکوہ کیا۔

"میں مانتا ہوں کہ آپ اور آپ جیسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نوجوان اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کی خاطر دن رات انتھک محنت سے پڑھتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اس انتھک محنت کا سوچ کے مطابق صلہ نہیں ملتا۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔" رب نواز محمود کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"جب تک آپ کی مطلوبہ نوکری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ آپ اپنے لیے پریشانی کیوں کھڑی کرتے ہیں؟ معقول جاب ملنے تک کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟ خواہ مخواہ اپنی صحت اور وقت کیوں برباد کرتے ہیں؟"

محمود جواب دینے کے بجائے خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔

"بولو کوئی اور کام کرو گے؟ مجھے ہاں یا نہیں میں جواب چاہیے۔" رب نواز بولا۔

"ہاں۔" محمود نے دھیرے سے کہا۔

"اگر تمہارا جواب "ہاں" ہے تو پھر اپنے دل و دماغ کو مایوسی میں اُلجھا کر ہمت اور حوصلہ کیوں ہارتے ہو؟ آپ کو اپنی سوچ بدلنی ہوگی دُرست سمت میں سوچنا ہوگا۔" رب نواز محمود کے چہرے پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔

"مجھے اندازہ ہے کہ تُم جیسے کم ہمت نوجوان حالات کا مقابلہ کرنے کی بجائے جلد ہی ہار مان کر خودکشی کے لیے پھندے تیار کرنے لگتے ہیں۔ پٹڑی اور کنوئیں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یار آپ لوگ اس طرح منفی خیالات کو اپنے دل و دماغ میں کیوں جگہ دیتے ہو؟ اس وقت آپ لوگوں کو ان اپنوں کا خیال کیوں نہیں آتا جو حقیقت میں آپ لوگوں کے اپنے ہوتے ہیں۔ آپ کو غلط سمت میں سوچتے اور چلتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی بوڑھی ماں کا خیال نہ آیا جو آپ کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہے۔" رب نواز کا چہرہ غُصّے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا اور محمود اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا کیونکہ رب نواز اس بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ داستانِ غم سنانے کے دوران جو بات محمود گول کر گیا تھا وہ رب نواز کی زبان پر آ گئی تھی۔ کیوں اور کیسے؟ اسی بات نے محمود کو حیران کر دیا تھا۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے لوگوں کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے چہرے پڑھنے کا فن بھی سیکھ لیا ہے!" رب نواز نے کہا اور پھر اچانک محمود کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"بولو جواب دو! میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے! ایسے گھٹیا انداز میں سوچتے ہوئے آپ کو اپنی ماں کا خیال کیوں نہیں آیا؟"

محمود جواب دینے کے بجائے بدستور شرمندگی کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا اور رب نواز اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔

"مجھے میرے سوال کا جواب دو۔" رب نواز نے دوبارہ پوچھا۔

"اماں کا خیال آیا تھا اسی لیے میرے اندر بہت دیر تک جنگ ہوتی رہی اور پھر

اچانک مجھے تمہارا خیال آیا اور میں ایک قلی سے تمہارے بارے میں پوچھ کر تم سے آملا۔" محمود نے ایک لمحہ کے لیے رب نواز کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ نظریں جھکالیں۔

"بابو جی!" رب نواز اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا، "میں بھی پڑھا لکھا ہوں اور میں نے روزگار کے سلسلے میں آپ سے زیادہ دھکے کھائے ہیں۔ ایک دو بار مایوس ہوا لیکن اس کے بعد میں نے مایوسی کو اپنی زندگی سے نکال کر دور بلکہ بہت دور پھینک دیا اور گھر کا بوجھ اُٹھانے کی خاطر دوسروں کا "بوجھ" اُٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ دوسروں کا بوجھ اُٹھاتے ہوئے مجھے تین سال ہو گئے ہیں۔" رب نواز کہتے کہتے چند لمحوں کے لیے رُکا اور پھر دوبارہ بولا:

"اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے آپ پر رحمت کی اور آپ کو حرام موت مرنے سے بچا لیا۔ گاڑی آنے والی ہے میں چلتا ہوں۔ اب آپ ایسا کرو کہ سیدھے گھر جاؤ۔ دائیں بائیں جانے کی کوشش نہ کرنا اور کل صبح ٹھیک آٹھ بجے مجھے یہیں اسی جگہ ملنا۔"

محمود نے اثبات میں سر ہلایا اور رب نواز سے ہاتھ ملا کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آگیا۔

......☆......

دوسرے دن "عوام ایکسپریس" مقررہ وقت پر اسٹیشن پہنچی تھی۔ سفید شلوار اور سُرخ رنگ کے کُرتے میں ملبوس محمود (بی اے) ایک مسافر کا سوٹ کیس سر پر اُٹھائے آہستہ آہستہ "اوور ہیڈ برج" کی طرف بڑھ رہا تھا اور دُور کھڑا رب نواز اُسے فخریہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے اس نے ایک بھٹکے ہوئے انسان کو سیدھا راستہ دکھادیا تھا۔

☆......☆......☆

بقیہ: کوہ پیماء کا ایڈونچر

عید کا دن تھا اور اس بار قدرت بھی مہربان تھی۔ سفید برف سے ڈھکی چوٹی پر پاکستان کا پرچم لہراتے زین نے کیٹ کا ہاتھ بھی تھام رکھا تھا۔ کیٹ نے سمٹ مکمل کرتے اسے گلے لگا لیا۔

دو مختلف ممالک کے جھنڈے، دو مختلف افراد کے ہاتھوں سے لگے ہوئے تھے۔ لیکن دونوں کسی عزیز کی طرح ساتھ کھڑے تھے۔ عید کا تحفہ اس نے قوم کو چوٹی سر کر کے دے دیا تھا۔ نیوز چینلز پر چلنے والی خبر کہ "پاکستان کے 18 سالہ نوجوان نے دنیا کی مشکل اور سرد ترین قاتل چوٹی کو ایک غیر ملکی کوہ پیما کے ساتھ سر کرلیا ہے" کے ساتھ دونوں کی تصاویر چل رہی تھیں۔ ناقابلِ اعتبار برفیلی بلندی نے دونوں کوہ پیماؤں کو دوستی اور استاد شاگرد کے پیارے رشتے میں باندھ دیا تھا۔ پوری قوم کو اس پر فخر تھا پوری قوم کے لیے عید کا مزہ دوبالا ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

زویو کی بکری

سمیرا غزل

ایسی ہی تگڑی
ہاتھ نہ آئے
بھاگ ہی جائے
چارہ کھلاؤ
چاہے پانی پلاؤ
پر وہ نہ مانے
جھٹ وہ تو مارے
آنکھیں دکھائے
ٹانگیں چلائے
لاڈ دکھاتی
میں میں چلاتی
سر کو پٹختی
سب سے وہ لڑتی
زویو سے کہتی
زویو کی سنتی
زویو سے لپٹے
زویو پہ مرتی
زویو کی بکری
کیسی ہے تگڑی
زویو کی بکری

روشن چہرے

قیصر مشتاق

یونیورسٹی سے آتے آتے اسے اتنی دیر ہو جاتی کہ عشا کی جماعت نکل جاتی، مجبوراً اسے نماز گھر میں ادا کرنی پڑتی۔ ابھی بھی وہ سڑک سے گلی میں داخل ہونے لگا تو بجلی کی عدم موجودگی اسے مزید چڑا گئی۔ وہ بددلی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر کی طرف جا رہا تھا لفتاً اس کی نظر سڑک کے کونے والے ایک عالیشان بنگلے پر پڑی۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ کچھ ہفتے پہلے ہی خالی ہوا تھا اور اب شاید وہاں نئے مکین آ گئے تھے۔ ایک طرف کھڑی بڑی گاڑی سے سامان اتار اجا رہا تھا اور کچھ لوگ پاس ہی کھڑے ملازمین کو ہدایت دے رہے تھے۔ وہ سرسری نظر دوڑاتا آگے نکل آیا۔

علی کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا، وہ ساتویں جماعت میں تھا جب اس کے والد ایک طویل بیماری کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس کے بعد اس نے نہایت تکلیف دہ حالات دیکھے، ماں کو گھروں میں کام کرتے دیکھا، رات رات بیٹھ کر کپڑے سلائی کرتے دیکھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے ترستے دیکھا۔ لیکن پھر اس نے نویں جماعت کے بعد سے ہی ایک دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ کالج تک وہ رشید چاچا کے کریانہ سٹور پہ بیٹھ کر گھر کے اور اپنے تعلیمی اخراجات میں ماں کا ہاتھ بٹاتا رہا، لیکن پھر جیسے ہی اسے یونیورسٹی میں داخلہ ملا وہ شدید الجھن میں پڑ گیا۔ دراصل اس کا داخلہ سہ پہر کی شفٹ میں ممکن ہوا تھا جس کی فیس صبح کی کلاس سے نہایت کم تھی۔ اب تک جو وہ بڑی مشکل سے سب نمٹا رہا تھا ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ رشید چاچا بھی دکان صبح میں کھولتے، سہ پہر میں وہ گھر چلے جاتے اور پھر رات تک دکان ملازم کے سپرد ہو جاتی۔ علی کو دکان پہ نہ جاتے ہوئے تیسرا روز تھا جب اماں نے اسے چھوٹے کی فیس کا بتایا۔ مہنگائی کے ہوشربا ماحول نے غریب کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اماں کی سلائی کی بدولت گھر میں مشکل سے گزارا ہو رہا تھا۔ فیس کی آخری تاریخ دیکھ کر علی چکرا ہی تو گیا تھا۔ ابھی بھی وہ افسردہ چہرہ لیے گھر میں داخل ہوا تو سیدھا کمرے میں آ گیا۔

پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا اسے مزید چڑا رہا تھا۔

مایوسی اس کے چہرے سے عیاں تھی اور رہ رہ کر اسے آنے والے دنوں کی فکر ستانے لگی۔ وہ یوں ہی ناامیدی میں بیٹھا تھا جب چھوٹی اس کے لیے پانی لے آئی۔

''بھائی! پانی پی لیں۔'' وہ ادب سے بولی۔

''یہیں رکھ دو۔'' وہ روکھے انداز میں بولا تو وہ پلٹ گئی۔

''کیا ہمیں جینے کا حق نہیں، کیا ساری مشکلات ہمارے حصے میں لکھ دی گئی ہیں۔'' وہ سوچتا ہوا پر شکوہ نظر سے اندھیرے میں ہی دیوار سے سر ٹکا کے بیٹھ گیا۔

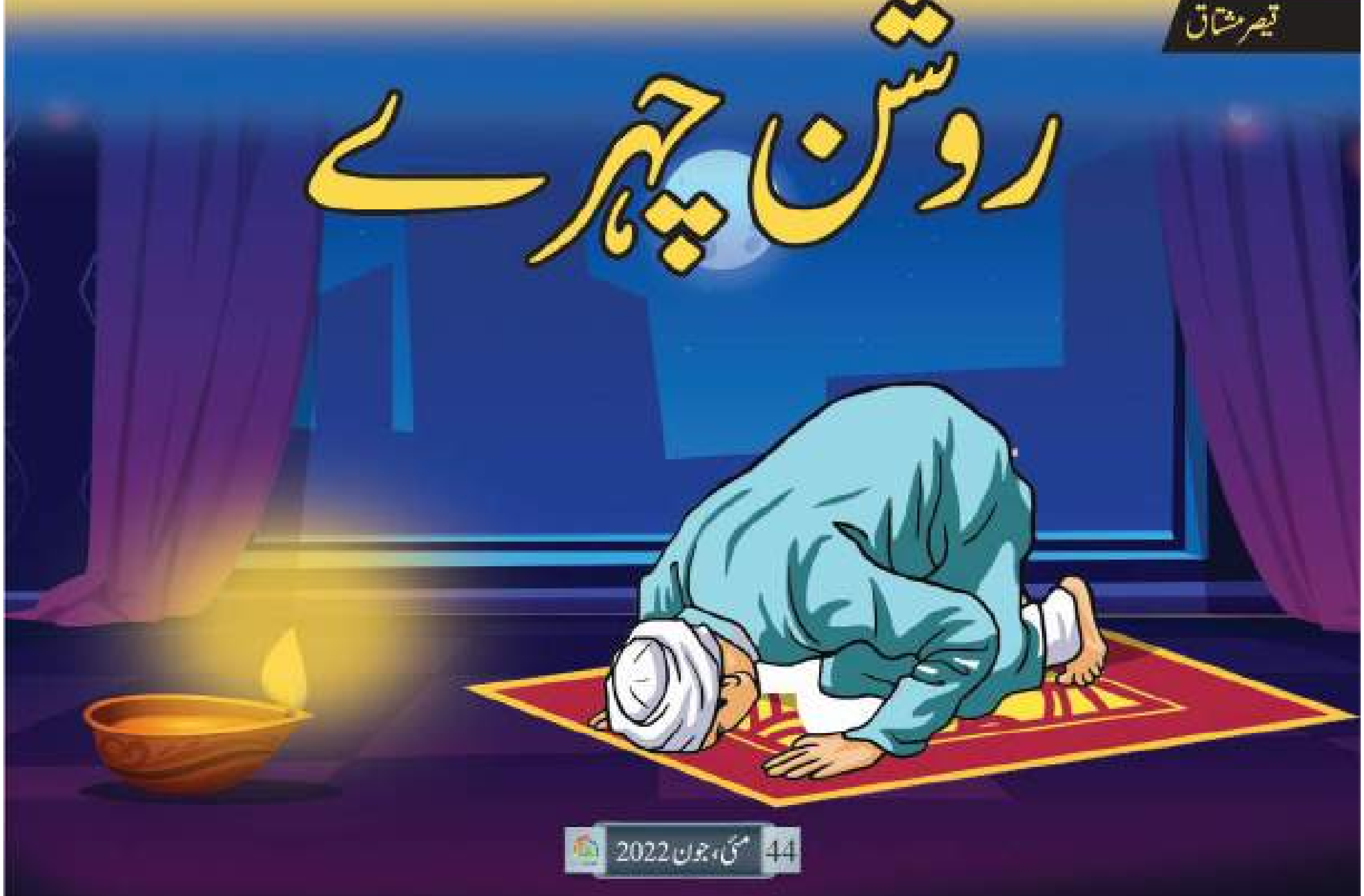

دفعتاً کمرے میں نہایت مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو اماں ہاتھ میں وہ پرانا دیا لیے کھڑی تھیں۔ موم بتی اور ایمرجنسی لائٹ کے خرچ سے بچنے کے لیے بہت پہلے علی یہ دیا لے آیا تھا جو تھوڑے سے گھی یا تیل سے کئی دن چل جاتا۔

جب جب بجلی غائب ہوتی وہ دیا تو اماں کی سلائی مشین کے پاس پایا جاتا یا امجد اور ربیعہ اس کی روشنی میں پڑھ رہے ہوتے۔

''اماں مجھے فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اسے لے جائیں۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''تھک گیا ہے میرا بیٹا؟'' اماں اس کی چارپائی کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ دیا انہوں نے اس کی ان سنی کرتے ہوئے کمرے کے درمیان رکھ دیا تھا۔ کمرے میں اب نرم سی روشنی ہو رہی تھی۔

''جی شاید تھک گیا ہوں۔'' وہ مختصر ابولا۔

''اچھا، میں کھانا لاتی ہوں تمہارے لیے، چھوٹوں نے بھی نہیں کھایا۔ یہیں لاتی ہوں سب اکٹھے کھالیں گے۔'' اماں نے اسے بتایا اور پھر اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ جب تک علی نے کھانا کھایا وہ اسی سوچ میں مبتلا رہا کہ وہ حالات کا سامنا کیسے کر سکے گا، نہ اسے اتنی جلدی کوئی نوکری مل سکتی تھی۔ نہ وہ کسی سے پیسوں کا تقاضا کر سکتا تھا۔ آخر کیسے؟

کہتے ہیں پیٹ خالی ہو تو انسان درست سمت میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ابھی بھی علی کے پیٹ میں آلو کی بھجیا اور چپاتی کے چند ٹکڑے گئے تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ اب تک وہ اندھیرے میں بیٹھا افسردگی کا شکار ہو رہا تھا لیکن دیے کی روشنی اب اسے اندھیرا چھٹنے کا عندیہ پیش کر رہی تھی۔ تب اسے یاد آیا کہ اس نے عشا ابھی تک نہیں پڑھی۔ وہ وضو کے لیے اٹھا، نماز ادا کی اور پھر دیر تک مصلے پہ بیٹھا اللہ سے دعا مانگتا رہا۔ وہ پرانا دیا عین اس کے سامنے تھا اور اسے جیسے کوئی نئی طاقت اور امید کی روشنی کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ ڈھیروں دعاؤں کے بعد اٹھا اور پھر سوچنے لگا کہ وہ کس طرح سے حالات کے لیے خود کو تیار کر سکتا ہے۔ نیند کب اس کی سوچوں پہ غالب آ گئی اسے پتہ بھی نہ چلا۔ سوتے ہوئے اب اس کے چہرے پہ مایوسی نہیں تھی، کچھ کرنے کی جستجو تھی۔ وہ صبح میں کوئی کام کر سکتا تھا۔ پہلے کی طرح ٹیوشن نہیں پڑھا سکتا تھا لیکن کچھ ایسا وہ ضرور کر سکتا تھا جس سے کچھ آمدن ہو جائے۔ لیکن اس سے قبل ہی شاید اس کی سن لی گئی تھی۔

......☆......

اگلا دن یوں ہی گزر گیا علی ظہر میں رشید چاچا کی طرف گیا لیکن وہ اسے نظر نہ آئے۔ وہ کچھ کتابوں کو ترتیب دے رہا تھا جب دروازہ بج اٹھا۔ اماں آرام کی نیت سے لیٹی تھیں، چھوٹے بہن بھائی مدرسے گئے تھے۔ وہ دروازے کی طرف آیا تو سامنے ہی اسے وہ اجنبی شخص کھڑا نظر آیا جس نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔ لباس اور شکل سے وہ علی کو کافی مرعوب کر رہا تھا۔

''وعلیکم السلام! معاف کیجیے گا، میں نے پہچانا نہیں آپ کو؟'' علی نے کہا۔

''میں رحمت مرتضیٰ ہوں، حال ہی میں یہاں اس علاقے میں منتقل ہوا ہوں۔ دراصل میں فارسٹ ڈیپارٹمنٹ سے ہوں اور کئی بار میرے لیے فیملی کو ساتھ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بار مجھے یہاں سے تھوڑی دور منتقل کیا گیا ہے لہٰذا ادارے کی طرف سے مجھے یہاں بنگلہ ملا ہے۔'' وہ شخص روانی سے بولتا چلا جا رہا تھا جب اسے علی الجھن کا شکار محسوس ہوا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' اس نے اجازت مانگی۔

''ہاں! کیوں نہیں، آیئے۔'' علی اس نفیس سے شخص کو بیٹھک میں لے آیا۔

''مجھے رشید چاچا نے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ میں ان ہی کے حوالے سے آیا ہوں۔'' وہ بیٹھنے کے بعد بولا تو علی کو صورتحال سمجھ میں آنے لگی۔

''میرے دو بیٹے ہیں، بڑا بیٹا تو سکول جاتا ہے لیکن چھوٹا ——'' وہ رک گیا۔

''چھوٹا؟'' علی نے سوال پوچھا۔

''میرا چھوٹا بیٹا چلنے پھرنے سے معذور ہے، دو سال پہلے وہ چھت سے گر گیا تھا۔ ہم نے اس کے بعد اسے سکول نہیں بھیجا۔ وہ نفسیاتی طور پر کافی حساس ہو گیا ہے۔ گھر پہ رہنا پسند کرتا ہے۔ کیا تم اسے صبح میں کسی بھی وقت پڑھا سکتے ہو، مجھے صبح فجر کی نماز میں رشید چاچا ملے تھے، وہ میرے گاؤں سے ہی ہیں اور میری پریشانی کا سن کر ہی انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

اس کا آخری جملہ علی کو حیران ہی تو کر گیا۔ وہ کب سے ایسے سٹوڈنٹس ڈھونڈ رہا تھا جنہیں وہ صبح میں پڑھا سکے تاکہ سہ پہر میں یونیورسٹی جا سکے۔ لیکن اسے یہ ناممکن سی بات لگتی تھی اور اب اچانک اسے یہ سن کر نہایت حیرت ہو رہی تھی۔ لیکن رحمت مرتضیٰ کے اگلے جملے نے اسے مزید حیران کر دیا۔ وہ اسے دو بچوں کی فیس اپنے ایک بیٹے کے لیے دے رہا تھا۔ اس نے رحمت مرتضیٰ کو فوراً ہاں کر دی تھی جو واقعی اس کے لیے رحمت بن کر آیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے علی سے مکان کی ملکیت کا پوچھا تھا اور کرائے کا مکان خالی کروا کے اور اس کے خاندان کو اپنی انیکسی میں رہنے کی آفر بھی دے گیا تھا۔

دو ہفتوں بعد علی اماں کی رضامندی دیکھ کر سب کو لیے انیکسی میں شفٹ ہو گیا تھا۔ شریف النفس رحمت مرتضیٰ کی طرح اس کی فیملی میں بھی نہایت اچھے لوگ تھے اور اس علاقے میں مستقل رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چند لمحوں میں زندگی کی الجھنیں یوں سلجھ جائیں گی علی نے سوچا نہ تھا۔ وہ اس رات اپنی ادا کی گئی اس عشا کی نماز اور پھر اس روشن دیے کو بار بار یاد کر رہا تھا۔ وہ دیا جو وہ سامان اٹھاتے وقت ساتھ رکھنا نہیں بھولا تھا۔ اسے اس رات اماں کے جلائے اس دیے میں بھی رشید چاچا تو کبھی رحمت مرتضیٰ چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تب وہ سمجھا تھا دنیا میں رہتی اچھائی کے اسباب میں سے وہ دو روشن چہرے بھی تو تھے جنہیں خدا نے اس کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔☆

خوفناک تجربہ

سیدہ اقراء اعجاز

اخبار پڑھتے ہوئے مائیکل کی نظر ایک خبر پر جا کر ٹھہر گئی۔ یہ کسی کمپنی کا اشتہار تھا۔ وہ کمپنی لوگوں کی بہادری کو ٹیسٹ کرتی تھی، اور جیتنے والے کو 10 ہزار ڈالر ملتے تھے۔ مائیکل کے لئے تو یہ کسی خواب سے کم نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ گیا اس تجربے کے لئے تو ضرور جیتے گا۔ وہ بچپن سے ہی بے حد بہادر انسان تھا۔ اس کی اسی خوبی کی وجہ سے اس کے دوست اسے ٹارزن بولا کرتے تھے۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی، مائیکل نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف اس کا دوست جان تھا۔ جان چھوٹتے ہی بولا:

''آج کے اخبار میں تم نے تجربے والی خبر تو پڑھ ہی لی ہوگی، تو بتاؤ پھر کب جا رہے ہو دس ہزار ڈالر جیتنے؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''کل ہی جاؤں گا اور جیت کر بھی آؤں گا'' مائیکل نے بھی پر جوش آواز میں کہا۔ اسے خود پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ ضرور جیتے گا یہ مقابلہ۔ اگلے دن مائیکل پورے دل سے تیار ہوا۔ اس نے ایک نظر اپنے آپ کو آئینے میں ستائشی نظروں سے دیکھا۔ انٹرویو کی ٹائمنگ شام پانچ بجے رکھی گئی تھی۔ پانچ بجتے ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے وہ اخبار میں لکھے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ یہ ایک قدرے سنسان علاقہ تھا اور آبادی سے ہٹ کر تھا۔ یہ جگہ مائیکل کے لئے بالکل نئی تھی۔ وہ پہلے کبھی یہاں نہیں آیا تھا۔ تھوڑا آگے چلنے پر اسے اپنی مطلوبہ بلڈنگ بھی مل گئی۔ اس نے اعتماد کے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ بلڈنگ میں ایک دو لوگ ہی دکھائی دیئے وہ بھی عجیب سے حلیے میں۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد مائیکل کو وہ آفس بھی مل گیا۔ جس کے بارے میں لکھا تھا اخبار میں۔ آفس کے باہر سادہ سی تختی لگی ہوئی تھی۔ جس پر صرف چار الفاظ درج تھے۔ کیا آپ بہادر ہیں؟ اخبار میں بھی یہ ہی بتایا گیا تھا۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک بینچ بنی ہوئی تھی۔ جس پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا وہ بھی شاید انٹرویو کے لئے آیا تھا۔ مائیکل بھی اس کے برابر میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے مائیکل کو دیکھا تک نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اندر آفس سے آواز آئی، مسٹر پیٹر واپس جا سکتے ہیں۔ وہ ٹیسٹ میں فیل ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ آدمی اٹھا اور بنا کچھ کہے آفس سے باہر نکل گیا۔ مائیکل کو آفس والوں کے اس عجیب طریقہ کار پر حیرت ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ آواز

آئی، جو انٹرویو کے لیے بیٹھے ہیں وہ اندر تشریف لے آئیں۔ ظاہر ہے مائیکل کے علاوہ تو کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ مائیکل نے آفس کی طرف قدم بڑھا دیے۔ یہ ایک نہایت شاندار آفس تھا۔ اندر جاتے ہی اے سی کی ٹھنڈی ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ اندر آفس میں صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بلیک تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر داڑھی تھی۔۔۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنے سامنے والی کرسی پر مائیکل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مائیکل پر اعتماد طریقے سے چلتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے بات کا آغاز کیا۔

''جیسا کہ تم اخبار میں پڑھ ہی چکے ہو گے کہ یہ جو ٹیسٹ ہم لیتے ہیں یہ بہت ہی خوفناک قسم کا بھی ہو سکتا ہے۔ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ اس لیے یہ تجربہ تم صرف اپنی ذمہ داری پر ہی کرو گے۔ تم چاہو بھی تو تجربے کو بیچ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اور یہ بات تمہیں مجھے اس کاغذ پر بھی لکھ کر دینی پڑے گی۔'' اس نے مائیکل کی طرف ایک کاغذ بڑھا دیا۔ مائیکل نے کاغذ پر صاف صاف لکھ دیا کہ وہ یہ تجربہ اپنی خود کی ذمہ داری پر کر رہا ہے۔ کسی بھی نقصان کی ذمہ دار کمپنی نہیں ہوگی۔ وہ آدمی مسکرایا اور بولا:

''تم مجھے ایک بہادر انسان لگ رہے ہو۔ جو یقیناً کسی چیز سے نہیں گھبراتا۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً یہ ضرور پوچھتا کہ یہ کس قسم کا تجربہ ہوگا لیکن تم واقعی بہت بہادر ہو۔'' مائیکل مسکرایا۔ وہ آدمی مائیکل کو لے کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک سیاہ رنگ کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ اس نے مائیکل کو دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ مائیکل نے ایک لمحے سوچا اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک عجیب سی جگہ تھی۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ وہ تھوڑا آگے بڑھا تو ایک آدمی اسے نظر آیا جو سفید کوٹ پہنے ہوئے تھا لیکن اس کے کوٹ پر تازہ خون کے چھینٹے تھے۔ اس آدمی کا رخ دوسری طرف تھا۔ مائیکل اس کے پاس گیا اور اس کا رخ اپنی طرف موڑا تو ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس آدمی کی آنکھیں نہیں تھی اور نہ ہی ناک تھی۔ خالی ہونٹ تھے جو اس کے چہرے پر حد سے زیادہ بھیانک لگ رہے تھے۔ مائیکل ڈر کر ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے بھاگتے وہ بہت دور نکل آیا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لڑکی ایک بہت خوبصورت برائیڈل ڈریس میں کھڑی تھی۔ اس کا ڈریس وائٹ تھا۔ چہرے پر وائٹ ہی دوپٹہ تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا مائیکل کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔ اس نے اس لڑکی سے پوچھا:

''کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ وہ لڑکی چپ چاپ ایسے ہی کھڑی رہی۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ میں چاقو نمودار ہوا اور اس نے چاقو سے مائیکل پر حملہ کر دیا۔ مائیکل اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چاقو اس کے کندھے میں پیوست ہو گیا۔ وہ چیختے ہوئے زمین پر گر گیا۔ اسے بے حد درد ہو رہا تھا اور یہاں آنے پر پچھتاوا بھی ہو رہا تھا۔ نجانے کب وہ درد کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔ بہت دیر بعد اس کو ہوش آیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کو چکر بھی آ رہے تھے۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور ایک طرف کو چلنے لگا۔ اچانک اسے کوئی عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ آواز بہت قریب سے آ رہی تھی۔ مائیکل آواز کی سمت میں چلنے لگا۔ اچانک اس کو سامنے وہی کمپنی کا باس نظر آیا اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

وہ بولا:

''تم واقعی ایک بہادر آدمی ہو۔ لیکن یہ بہادری تمہارے کس کام کی جب تم زندہ ہی نہیں رہو گے۔'' مائیکل چونک کر بولا:

''کیا مطلب؟''

مطلب یہ کہ یہ سب ایک کھیل ہے۔ بے روزگار لوگوں کو اس طرح انٹرویو کے لئے بلانا اور ان کے اوپر تجربات کرنا۔ مجھے اپنے تجربے کے لئے ایک بہادر آدمی کی ضرورت تھی اس لئے میں نے اخبار میں اشتہار دیا اور وہ جو آدمی انٹرویو کے لئے بیٹھا ہوا تھا تم سے پہلے وہ بھی میرا ہی آدمی تھا۔ میں ایک سائنسدان ہوں اور آج کل میں ایک نیا تجربہ کر رہا ہوں کہ اگر بندر کے اندر کسی بہادر آدمی کا دل لگا یا جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اور میری تلاش اب ختم ہو گئی مجھے تم مل گئے۔'' تین چار اور لوگ بھی کہیں سے اچانک نکل آئے انہوں نے آتے ہی مائیکل کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔۔۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ تجربہ کامیاب ہو سکے گا یا ڈاکٹر کو کوئی اور شکار کرنا پڑے گا کون جانے؟

☆......☆......☆

کنول

انتہائی پر کشش اور بڑے سائز کے خوشبودار پھولوں کی وجہ سے بہت پسند کیا جاتا ہے اور بہت پر کشش کٹ فلاور کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک آبی پودا ہے، چوڑے پتے پانی کی سطح پر تیرتے ہیں۔ برسات (جولائی اگست) کے دوران اس کے پھول کھلتے ہیں۔ اس کو افزائش کے لیے ہمیشہ کھڑے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو گھر اور چھوٹی نرسریوں میں تو نہیں اگایا جاتا لیکن جھیلوں اور پانی کے دائمی ذخیروں (Reservoirs) میں اس کی افزائش بہتر ہوتی ہے۔ بڑی نرسریوں میں بھی اسکو بڑھایا جا سکتا ہے۔

شیف ثانی

شیر خورمہ

عاجزہ ارشد

عید کی مبارکباد دینے کے لیے شیف ثانی کی سب سے سہیلیاں آئیں تھیں اور گھر میں مزیدار بریانی بنی ہوئی تھی۔ مگر سب کو شیر خورمہ کھانا تھا۔ شیف ثانی نے سب سے دس منٹ انتظار کا کہا اور مزیدار شیر خورمہ بنانے لگی۔ شیر خورمہ کے لیے جو اجزاء درکار تھے وہ شیف ثانی نے اکٹھے کیے۔ وہ کچھ اس طرح تھے۔

اجزاء

دودھ	دو لیٹر
بادام، پستہ	آدھا کپ
چھوہارے	ایک کپ
سویاں	ایک کپ
چینی	ڈیڑھ کپ
الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
کنڈینسڈ ملک	ایک ڈبا
گھی	دو کھانے کے چمچ
کیوڑہ	تین قطرے

چھوہاروں کو رات بھر بھگو کر آدھا لیٹر دودھ میں اتنا پکا لیں کے وہ گل جائیں۔

سب سے پہلے شیف ثانی نے ایک دیگچی میں گھی ڈال کر گرم کیا اور الائچی پاؤڈر ڈال دیا جب الائچی کی خوشبو آنے لگی تو چینی، کنڈینسڈ ملک آدھا پستہ، بادام ڈال کر مکس کیا اور اتنا پکایا کے دودھ تھوڑا گاڑھا ہوگیا۔ پھر دودھ میں پکے چھوہارے بھی ملا دیے۔ پانچ منٹ اور پکایا اور شیف ثانی کا شیر خورمہ تیار ہوگیا۔ شیف ثانی نے شیشے کے خوبصورت سے ڈونگے میں شیر خورمہ نکالا بچے ہوئے پستے بادام اُن پر چھڑک کے تین قطرے کیوڑہ ڈالا۔ پورے گھر میں شیر خورمے کی خوشبو پھیل گئی تھی۔

شیف ثانی اور اُن کی سہیلیوں نے خوب مزے سے شیر خورمہ کھایا۔ آپ سب بھی شیف ثانی کی ترکیب سے شیر خورمہ بنائیں اور خوب لطف اُٹھائیں۔

ساشا اور کوکو کا ایڈونچر

فرزین لہرا

آج زینی بہت خوش تھی۔ ابھی ٹیچر نے بتایا تھا کہ کل چونکہ اسکول میں ٹیچرز کی ورکشاپ ہونے والی ہے اس لئے تمام بچوں کو کل چھٹی دے دی گئی ہے۔ چھٹی بھلا کس بچے کو بری لگتی ہے تو ہماری پیاری زینی بھی خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ زینی کے دماغ میں چھٹی کے حوالے سے بہت کچھ چل رہا تھا۔ شاید وہ اپنی نانی کے گھر چلی جائے یا پھر اس چھٹی کو دادی کے گھر گزارا جائے۔ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جوتے کے تسمے کھول دیئے ہوں۔ لیکن ایسا کون کر سکتا ہے بھلا؟ زینی نے نیچے جھک کر دیکھا تو تسمے تو واقعی کھلے ہوئے تھے۔ زینی نے ایک بار پھر تسمے باندھ دیئے اور اپنی سوچوں میں گم ہوگئی کہ ایک بار پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے جوتے کا تسمہ کھینچا ہے۔ زینی نے تیزی سے ڈیسک کے نیچے جا کر دیکھا تو اس کے جوتے پر دو ننھے منے سے بونے بیٹھے جوتے کے تسمے کو کھینچ رہے تھے۔ زینی خوش ہوئی۔ ''ارے! یہ تو وہی ساشا اور کوکو ہیں۔'' بونے بھی اسے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلانے لگے۔ زینی ڈیسک کے نیچے جا کر بیٹھ گئی اور خوشی پوچھنے لگی۔

''ارے ابھی کہاں غائب تھے تم دونوں؟ اور آج اچانک کیسے؟''

بونوں میں سے ایک بونا جس کا نام ساشا تھا کہنے لگا:

''مصروفیت ہی ایسی تھی کہ ہم آ نہیں سکے۔ اصل میں ہمارے گھر کے پاس جو چاکلیٹ کی ندی بہتی ہے اس کے کنارے پر لگے بسکٹ کے درخت پر بہت زیادہ بسکٹ آ گئے تھے اور چاکلیٹ کی ندی میں گرنے لگے تھے۔ تو ہم اس بسکٹ کو محفوظ کرنے میں مصروف تھے۔ جیسے ہی فراغت ہوئی تو ہمیں ہماری دوست زینی یاد آ گئی اور ہم چلے آئے۔''

زینی اپنی آنکھوں میں دنیا بھر کی حیرت سموئے ساشا کا چہرہ تکنے لگی، چاکلیٹ کی ندی اور بسکٹ کے درخت!!

کوکو بیچ میں کودتے ہوئے بولا:

’’ارے! تمھیں یقین نہیں آ رہا تو چلو ہمارے ساتھ ہماری دنیا میں۔ ہم دکھاتے ہیں تمھیں۔‘‘

زینی نے کچھ لمحے سوچا لیکن پیا فراتی پر کشش تھی کہ وہ رہ نہ سکی۔

’’کتنی دیر میں واپسی ہو جائے گی؟ ابھی تو بریک چل رہی ہے۔ اس کے بعد تو مجھے کلاس میں ہونا ہی ہے۔ ساشا نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا، تمھاری دنیا اور ہماری دنیا کا وقت بہت مختلف ہے۔ یہاں تو وقت تیزی سے گزرتا ہے جب کہ ہماری دنیا میں وقت مانو ٹھہر ٹھہر کر گزرتا ہے۔ ہم آرام سے بریک ختم ہونے تک واپس آ جائیں گے۔‘‘

’’لیکن کوکو! کیا ہمارے پاس وہ کیپسول ہے جس سے ہم زینی کو اپنے جتنا کر سکیں؟‘‘

ساشا نے جیبیں کھنگالتے ہوئے کہا:

’’میرے خیال سے ایک تو نکل ہی آئے گا۔ ارے یہ رہا! مل گیا! زینی اس کیپسول کو کھا لو پھر تم ہمارے جتنی ہو جاؤ گی۔‘‘

زینی نے ایک چھوٹے سے کیپسول کو اپنے منہ میں رکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے نگلتی، کیپسول خود ہی پگھل گیا اور زینی کو ایسا لگا جیسے اسے ایک چکر سا آیا ہو۔ چکراتے سر کے ساتھ آنکھیں بند ہو گئیں اور جب کھولیں تو وہ ساشا اور کوکو کے برابر کی ہو چکی تھی۔

’’ارے ساشا! کوکو! تم لوگ اتنے لمبے کیسے ہو گئے بھلا؟‘‘ زینی نے حیرت سے پوچھا جس پر دونوں بونے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

’’ارے بھئی ہم تو اتنے ہی ہیں لیکن تم ہماری جتنی ہو چکی ہو۔‘‘ اس بات پر زینی بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اب ساشا اور کوکو اسے لے کر ایک دیوار تک پہنچے، اس دیوار کے پاس پہنچ کر ساشا نے اپنے ہاتھوں سے دیوار پر کوئی سائن بنایا اور دیوار میں ایک سرنگ پیدا ہو گئی۔ وہ تینوں اس اندھیرے راستے پر چلتے ہوئے سرنگ کے اختتام پر جا پہنچے جہاں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ سرنگ سے باہر آتے ہی زینی اس خوبصورت جگہ کو گھوم گھوم کر دیکھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہو۔ آسمان اتنا خوبصورت اور اس پر چمکتے سورج نے زینی کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلایا۔ زینی نے بھی جواباً اپنا ہاتھ فضا میں لہرا دیا۔ اب ساشا اور کوکو آگے آگے چل رہے تھے اور زینی کے پیچھے چل رہی تھی۔ راستے میں جتنے بھی پھول آئے وہ سب زینی کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہوا میں زور زور جھومنے لگتے۔ زینی دم بخود سی یہ جادوئی دنیا دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ندی بہنے کا شور قریب آتا جا رہا تھا اور جلد ہی وہ لوگ ندی کنارے پہنچ گئے۔ گہرے براؤن رنگ کی ندی زور و شور سے بہہ رہی تھی۔ ماحول میں آس پاس چاکلیٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مطلب ساشا اور کوکو سچ کہہ رہے تھے اور ان کی دنیا میں سچ مچ چاکلیٹ کی ندی بہتی ہے۔ لیکن بسکٹ؟ وہ کہاں ہیں؟ زینی نے ندی کے چاروں طرف اگے بڑے بڑے درختوں کو دیکھا تو سارے درخت بنا بسکٹ کے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سوال کرتی ایک ڈال پر اسے بسکٹ لٹکتے نظر آ گئے۔ زینی نے سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کی کٹوری بنا کر ندی سے تازہ بہتا ہوا چاکلیٹ پیا اور پھر ساشا اور کوکو سے فرمائش کی کہ وہ بسکٹ اسے لا کر دیں۔ ساشا تو کسی بندر کی مانند درخت پر چڑھ گیا اور فوراً ہی بسکٹ لے آیا۔ زینی نے جیسے ہی وہ بسکٹ کھایا اس کے منہ سے واہ نکلا۔ ایسا تازہ اور خستہ بسکٹ اس نے آج تک نہیں کھایا تھا۔ ساشا بھاگ کر ایک خالی گلاس لے آیا اور اس کو ندی کے بہتے چاکلیٹ سے بھر کر زینی کو پیش کیا۔ زینی وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور بسکٹ کو چاکلیٹ میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگی۔ اتنے میں ایک آواز آئی:

’’آرام سے بیٹھو اور مجھ پر چاکلیٹ نہ گرا دینا۔‘‘ زینی کے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ اس نے غور کیا تو یہ آواز اس پتھر کی تھی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ساشا اور کوکو زور زور سے ہنسنے لگے۔ زینی بھی کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگی۔ چاکلیٹ کی ندی سے دل بھر گیا تو ساشا اور کوکو اسے چپس کے کھیت لے گئے۔ وہاں ہر قسم کے چپس اُگے ہوئے تھے۔ زینی توڑ توڑ کر چپس اپنے منہ میں ڈالتی جاتی اور واہ واہ کہتی چلی جاتی۔ جب چپس کے کھیت ختم ہوئے تو وہیں سے فرنچ فرائیز کے کھیت شروع ہوئے، اب تو زینی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا اس نے خوب پیٹ بھر کر فرائیز کھائے۔ اتنا سارا کھا لیا تھا کہ اب زینی کو نیند آنے لگی تھی۔ اس نے ساشا اور کوکو سے کہا کہ اب وہ تھک گئی ہے اور گھر جانا چاہتی ہے۔ ساشا اور کوکو اسے اپنی ساتھ لئے اسی سرنگ کے پاس پہنچے۔ سرنگ سے گزرنے سے پہلے ایکدم ہی کوکو کو خیال آیا۔

’’ساشا! زینی کو بڑا کرنے والا کیپسول تو نہیں ہے میرے پاس۔ کیا تمھارے پاس ہے؟‘‘ ساشا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ زینی نے پریشانی سے ان دونوں کو دیکھا۔

’’کیا مطلب ہے کہ کیپسول نہیں ہے؟ ارے اب میں بڑی کیسے ہوں گی اور واپس اپنی دنیا میں کیسے جاؤں گی؟ ساشا اور کوکو بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ساشا بولا:

’’مجھے لگتا ہے کہ ہمیں ڈاکٹر بنی کے پاس جانا ہوگا اور ان سے وہ کیپسول لینا ہوگا۔ کوکو بھی اس سے متفق ہوا اور وہ دونوں زینی کو لئے سرنگ میں داخل ہو گئے۔

’’اس سرنگ میں ڈاکٹر بنی کا کلینک ہے؟‘‘ زینی نے پریشانی سے پوچھا۔ جب وہ پہلے اس سرنگ سے آئی تھی تب تو یہاں اسے نظر نہیں آیا تھا۔ ساشا اور کوکو ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز ہنسی ہنسنے لگے۔ سرنگ کے وسط میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ ساشا نے اس میں جھک کر آواز لگائی۔

’’ڈاکٹر صاحب! آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔‘‘ ابھی زینی کچھ پوچھنے ہی والی تھی اس کھوہ سے ایک چھوٹا سا خرگوش برآمد ہوا۔ زینی کو دیکھ کر چونک اٹھا اور کہنے لگا۔

’’یہ تو انسان ہے۔ یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ کیا تمھیں پتہ نہیں کہ انسان ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں؟‘‘ ساشا نے بات سنبھالتے ہوئے کہا:

''ڈاکٹر جی! یہ ہماری بہت اچھی دوست ہے اور چاکلیٹ کی ندی دیکھنا چاہتی تھی۔ بس اب واپس جاری ہے اور اس نے ہمیں یا ہماری دنیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔''

ڈاکٹر جی نے ناراضگی سے کہا:

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

کوکو نے بڑی ہی تمیز سے عرض کی:

''ڈاکٹر صاحب! زینی کو اپنی دنیا میں جانے کے لئے بڑا ہونے والا کیپسول درکار ہے۔ براہ کرم وہ عنایت کر دیں۔'' ڈاکٹر جی نے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا:

''یہ کیا حرکت کی ہے تم دونوں نے؟ پہلے تو اس بات کا بندوبست کرنا چاہئے تھا پھر ہی اسے اس دنیا میں لانا چاہئے تھا۔ اب اگر وہ کیپسول میرے پاس بھی ختم ہو گیا ہوگا تو؟ اور اگر آج ہی کے دن زینی کو دوبارہ اس کی دنیا میں نہ بھیجا تو یہ ہمیشہ کے لیے بونوں کی دنیا میں رہ جائے گی اور کبھی بھی دوبارہ انسان نہیں بن سکے گی۔'' یہ سن کر جہاں ساشا اور کوکو کے ہوش اڑ گئے وہیں زینی بھی رونے لگ گئی۔ اسے روتا دیکھ کر ڈاکٹر جی نے کہا:

''اب رونا بند کرو! میں جا کر اپنے دواخانے میں دیکھ کر آتا ہوں کہ کیپسول ہے یا نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ سے اپنی کھوہ میں غائب ہو گیا۔ ساشا اور کوکو اداس کھڑی زینی کو دیکھ کر شرمندہ ہو رہے تھے کہ ان کی لاپرواہی کی وجہ سے زینی کسی تکلیف میں بھی آ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر جی باہر آئے اور انہوں نے ایک کیپسول زینی کو دیتے ہوئے کہا:

''خوش قسمتی سے یہ ایک ہی کیپسول بچا تھا۔ آئندہ خیال کرنا اور کوئی بھی ایڈونچر کرنے سے پہلے اپنے ماں باپ کے بارے میں سوچنا کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں اور اگر تمہیں کچھ ہوا تو وہ کیا کریں گے۔''

زینی کو ان کی بات اچھے سے سمجھ آ گئی تھی۔ اپنی بات پوری کر کے ڈاکٹر جی اپنی کھوہ میں چلے گئے اور ساشا، کوکو، زینی کے ساتھ ان ہی سارے راستوں سے گزرتے ہوئے اس کے ڈیسک کے نیچے گئے۔ وہاں پہنچ کر زینی نے کیپسول کھایا اور وہی پہلے جیسا چکر اُسے آیا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ جب کھولیں تو وہ اپنے بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساشا اور کوکو اس کے پیروں کے پاس جاتے ہوئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ زینی نے بھی اللہ حافظ کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں نظر آنا بند ہو گئے۔ زینی نے چور نظروں سے اپنی کلاس کو دیکھا تو پتہ چلا کہ بریک ابھی تک چل رہی ہے اور کسی نے اس کی کمی کو محسوس نہیں کیا۔ زینی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری تو مزیدار ذائقے نے اُسے ایک بار پھر بونوں کی دنیا کے لذیذ کھانوں کی یاد تازہ کروا دی۔ زینی نے ڈیسک پر اپنا سر رکھتے ہوئے سوچا کہ اتنا زیادہ کھا لیا ہے کہ گھر جا کر دوپہر کا کھانا نہیں کھا سکے گی لیکن امی کو کیا وجہ بتائے گی؟ یہ ہی سب سوچتے ہوئے وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ ☆☆

عید آئی

حمیرا نوشین

عید آئی عید آئی
ڈھیر ساری خوشیاں لائی

مما نے شیر خرما بنایا
دادی نے بھی کھیر بنائی

باجی نے شرارہ پہنا
اور پہنا تھوڑا سا گہنا

بھیا نے جو واسکٹ پہنی
اک بات مجھے پڑی یہ کہنی

بھیا میرے سب سے پیارے
گھر بھر کی آنکھوں کے تارے

عید کی نماز پڑھ کے بابا آئے
سب نے ہی پھر ہاتھ پھیلائے

بہت سی ہم کو عیدی ملی
دل کی ہمارے کھلی کلی

سکھیاں سب ہی ملنے آئیں
اور سویاں بھی وہ لائیں

ہم نے اپنا پرس اٹھایا
اور گلی کا چکر لگایا

گول گپے، چاٹ اور بھلے
سب کچھ بہت مزے سے کھایا

جھولے والا بھی تھا آیا
پورا پاکستان گھمایا

تھک کر شام کو واپس آئے
دن یہ عید کا بار بار آئے

کبڑا اغوا کار

تحریم جمیل

آئرلینڈ کے قصبے ویسٹ لینڈز میں واقع ایک قدیم طرز کا وسیع وعریض مکان اپنے نئے مکینوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا جو حال ہی میں یہاں منتقل ہوئے تھے۔ ان مکینوں میں مسٹر ہیوبرٹ، ان کی بیوی سمانتھا، ان کی والدہ اور ان کا بارہ سالہ بیٹا اینڈی تھا۔ آئرلینڈ کی دفاعی افواج سے منسلک ہونے کی بنا پر انہیں وقتاً فوقتاً ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا پڑتا۔ اینڈی کے خود کے اعدادوشمار کے مطابق قریباً آٹھ سکول وہ اب تک بدل چکا تھا اور ایسے کئی مکانات تھے جو عارضی طور پر ان کا مسکن رہ چکے تھے۔ ان مسلسل تبدیلیوں کا اینڈی کی شخصیت پر گہرا اثر مرتب ہوا تھا۔ مختلف علاقوں کی مختلف صحبتوں اور رہن سہن کا اثر ہی تھا کہ اینڈی نہایت نڈر، بہادر، سخت جان مگر ضدی اور باغی طبیعت کا مالک بن چکا تھا۔

اپنا نیا گھر اینڈی کو پہلی نظر میں ہی کافی پسند آیا تھا۔ نہایت وسیع رقبے پر واقع یہ مکان کیتھولک چرچ سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تھا۔ مکان کو چاروں جانب سے سرو قد درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے جب ان درختوں کی شاخیں ایک ساتھ لہلہاتیں تو یوں لگتا جیسے یہ زمین سے نکل کر مکان کی جانب کھنچے چلے جا رہے ہیں۔

دن بھر اینڈی گھر سمیٹنے میں اپنے امی ابو کی مدد کرتا رہا۔ رات کھانے کے بعد اپنی دادی سے کہانیاں سن کر وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ جانتا تھا کل اس کا نئے سکول میں پہلا دن ہونے والا ہے اور وہ کسی طور بھی پہلے دن دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اینڈی کا نیا سکول گھر سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تھا۔ یہ فاصلہ اسے پیدل ہی طے کرنا تھا۔

صبح ہوتے ہی اینڈی تیار ہو کر سکول کی جانب چل دیا۔ پہلا دن ہونے کی بنا پر اس کے ابو اسے چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ چلے آئے۔

تین بجے سکول کی چھٹی ہوئی تو اینڈی سکول سے نکل کر گھر کی جانب چل دیا۔ چلتے چلتے ایک جگہ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔

اس کے سامنے ایک کبڑا آدمی تھا جس کی کمر پوری طرح جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے اور کمر پر سے ہڈیوں کے جیسے ابھار نکل رہے تھے اور اس نے نہایت بوسیدہ پیروں تک آتا چمڑے کا بے ڈھنگا سا لباس پہن رکھا تھا جس پر جگہ جگہ کئی سوراخ تھے۔ سکول سے نکلنے والے بہت سے بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ کبڑا انہیں محظوظ کرنے کے لیے عجیب وغریب کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ بلند آواز میں گا رہا تھا اور اپنی ہی آواز پر ناچ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اینڈی کے قدم اس کی جانب چل دیے اور وہ بھی ان بچوں کے ہمراہ وہ کرتب دیکھنے لگا۔ اس آدمی کے انداز میں ایسا جادو تھا کہ اسے وقت کا کچھ اندازہ ہی نہ ہو سکا اور قریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔

اچانک اسے اپنے پیچھے سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو کوئی عورت چیخ کر اپنے بچے کو آواز دے رہی تھی۔ اب اینڈی کو بھی گھر کی فکر ستانے لگی اور وہ یہ تماشا بیچ میں چھوڑ کر گھر کی جانب لپکا۔

اینڈی گھر پہنچا تو اس کی غصے میں لال ہوتی ماں نے اس کا استقبال کیا جو اس کے

دیر سے گھر آنے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔ اینڈی نے پورا قصہ اپنی ماں کو سنایا اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

اگلے دن اینڈی وقت سے پہلے سکول کے لیے تیار ہوا اور سکول کی جانب چل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ راستے میں پھر اس کبڑے آدمی کو دیکھ سکے۔ اینڈی ارد گرد نظر دوڑاتا چلتا جا رہا تھا پر اسے وہ کبڑا آدمی کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ اب وہ سکول پہنچ چکا تھا لہٰذا اس آدمی کا خیال جھٹک کر وہ سکول کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

چھٹی کے بعد وہ سکول سے نکلا تو وہ کبڑا پھر سے کل کی مختص جگہ پر نظر آیا۔ کل کے برعکس آج وہ ناچنے گانے کی بجائے کسی اداکار کی نقل کر رہا تھا۔ اپنی جھکی ہوئی کمر کے باوجود وہ پوری طرح اس اداکار کے انداز اپنائے ہوئے تھا۔ اس کی طرح چل رہا تھا، گردن پر زور دیے، ماتھے پر بل ڈالے، بازو خم کیے یہاں سے وہاں جھول رہا تھا۔ اینڈی کو اپنے ارد گرد ایک جادو سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی کمال اداکاری تو شاید وہ کردار خود بھی نہ کر سکتا تھا۔ اب تو اینڈی کے دل میں ایک شوق سا پیدا ہو گیا تھا۔

اسے جب بھی موقع ملتا وہ اس کبڑے آدمی کے گرد کھڑے بچوں میں شامل ہو جاتا۔ اکثر سکول سے واپس آنے کے بعد وہ امی سے اجازت لے کر اپنی سائیکل پر سوار ہوتا اور اس کبڑے آدمی کو ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ اس کا مقام وقت کے ساتھ بدلتا رہتا۔ تین بجے کے قریب وہ سکول کے سامنے ہوا کرتا، پانچ بجے وہ چرچ کے پیچھے واقع باغ کے احاطے میں نظر آتا۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ جانے کہاں غائب ہو جاتا۔ اینڈی اس آدمی کے متعلق مزید جاننا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں تجسس جنم لینے لگا تھا۔

چھٹی کے دن اینڈی گھر بیٹھا فراغت سے ٹی وی دیکھ رہا تھا جب اچانک اس کے ابو گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

''کیا ہوا سب ٹھیک ہے؟'' مسز سامنتھا کو مسٹر ہیوبرٹ کچھ پریشان دکھائی دیے۔

''اس علاقے میں کچھ گڑبڑ ہے۔'' مسٹر ہیوبرٹ ایک کرسی گھسیٹ کر اس پہ بیٹھ گئے۔ مسز سامنتھا کچن شیلف کا سہارا لیے کھڑی تھی۔

''کیا گڑبڑ ہے؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔'' مسز سامنتھا نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''اس علاقے سے بچے غائب ہو رہے ہیں۔ کوئی گیارہ بچے اب تک لاپتہ ہو چکے ہیں اور پولیس انہیں اب تک ڈھونڈنے میں ناکام ہے۔'' مسٹر ہیوبرٹ نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''یہ تو کافی پریشانی کی بات ہے۔'' مسز سامنتھا نے کہا۔

''خیال رکھنا کہ اینڈی بلا مقصد گھر سے باہر نہ نکلے۔'' مسٹر ہیوبرٹ نے تشویش سے کہا۔

مسز سامنتھا نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ دونوں اس بات سے ناواقف تھے کہ اینڈی دیوار سے کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اگلی صبح سکول جانے کے لیے اینڈی گھر سے نکلا تو سیدھا راستہ لینے کی بجائے لمبے ڈگ بھرتا موڑ کاٹتا اس کیتھولک چرچ کی پچھلی جانب چلنے لگا جہاں باغ میں وہ کبڑا بچوں کے ساتھ شام کے وقت نظر آیا کرتا تھا۔ راستہ پار کرتا اینڈی قدرے آگے کو نکل گیا تھا۔ وہ اس کبڑے آدمی کا ٹھکانہ ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یقیناً یہاں آس پاس ہی اس کا بسیرا ہوگا۔ ویسے بھی یہ علاقہ قدرے غیر گنجان آباد تھا۔ کافی پیدل چلنے کے بعد اسے درختوں کے درمیان ایک بلند و بالا عمارت دکھائی دی جو کافی تباہ کن حالت میں تھی اور عنقریب زمین بوس ہونے کو تھی۔ اینڈی نے آگے بڑھ کر اس کے زنگ آلود لوہے کے فریم سے لٹک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی پر اسے سیلن زدہ فرش اور جالوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

اسے سکول کے لیے دیر ہو رہی تھی سو مزید وقت برباد کیے بغیر وہ سکول کی جانب بھاگ گیا۔ سکول سے واپسی پر گیٹ پھلانگتا اینڈی اس جگہ پہنچا جہاں وہ کبڑا بیٹھا کرتا تھا پر آج وہ کبڑا اس جگہ موجود نہیں تھا۔ باقی بچوں کی طرح وہ بھی مایوس ہو کر واپس گھر کو لوٹ گیا۔

شام ساڑھے چار بجے کے قریب اینڈی پچھلے باغ میں جانے کے ارادے سے اپنی امی کے پاس آیا۔

''ممی! کیا میں کچھ دیر باہر کھیلنے جا سکتا ہوں؟'' اینڈی نے حسب معمول اجازت طلب کی۔

''نہیں اینڈی! تمہارے ڈیڈ نے منع کیا ہے۔ تم اپنے دوستوں کو یہیں بلوا لو گھر پر۔'' سامنتھا نے اینڈی کو جانے سے منع کر ڈالا۔

اینڈی کو کافی مایوسی ہوئی۔ اگر وہ گھر سے باہر نہ گیا تو اس آدمی کی حقیقت کیسے جانے گا۔ اینڈی نے ایک بار پھر ہمت مجتمع کی اور گویا ہوا۔

''پلیز ممی! میں جلد واپس آ جاؤں گا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے۔'' اس نے رحم طلب نظروں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا۔

سامنتھا کا دل پگھل گیا۔ ''ٹھیک ہے چلے جاؤ، مگر اپنے ڈیڈ کے آنے سے پہلے لوٹ آنا۔''

اینڈی نے خوش ہو کر ماں کو گلے سے لگایا اور اپنی سائیکل پر سوار ہو کر باغ کی جانب چل دیا۔ جوں ہی اینڈی نے باغ میں قدم رکھا اسے بچوں کا ایک سیلاب نظر آیا جو اس کبڑے آدمی کو گھیرے ہوئے تھا۔ حسب معمول وہ بچوں کو ناچ ناچ کر دکھا رہا تھا اور بچے اسے برابر داد دے رہے تھے۔

آج پہلی بار اینڈی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ایک ہی بچے پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ اسی کو یک ٹک دیکھتے ہوئے اپنا ناچ دکھا رہا تھا۔ وہ بچہ بھی مدہوش ہوئے اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

قریباً دو گھنٹے یہی کھیل چلتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ بچے گھروں کو لوٹنے گئے اور اکا دُکا بچے وہاں رہ گئے تھے۔ وہ بچہ اب تک وہیں بیٹھا تھا جو اس کبڑے آدمی کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا۔

اینڈی بھی اب واپسی کا ارادہ لیے اپنی سائیکل پر سوار ہوا اور وہاں سے نکلنے کو تھا جب اس نے دیکھا کہ وہ بچہ اس آدمی کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور ہر سو اب اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اینڈی اپنی سائیکل باغ میں چھوڑ کر خاموشی سے ان دونوں کا پیچھا کرنے لگا۔ باغ سے چلتے چلتے وہ دونوں اس عمارت کی جانب چلنے لگے جہاں اینڈی صبح آیا تھا۔ چلتے چلتے اس کبڑے آدمی نے ایک نیا روپ لے لیا تھا۔ کمر سے اٹھتی کہار اور ہڈیاں اب غائب ہو چکی تھی اور وہ کسی عام آدمی کی طرح سیدھا چلتا جا رہا تھا۔ جب کہ وہ بچہ بھی سدھ بدھ گنوائے اس کے ہمراہ چلتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک اس آدمی نے شاید کچھ محسوس کیا کہ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

خوش قسمتی سے اینڈی عین وقت پر ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ پر وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سے آگے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے یہیں سے واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔

باغ سے اپنا سائیکل لے کر اینڈی اپنی پوری رفتار سے گھر کی جانب چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ مسٹر ہیوبرٹ غصے سے ہانپتے اس کی جانب آئے۔

''یہ وقت ہے گھر آنے کا؟'' مسٹر ہیوبرٹ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''سوری ڈیڈ! کھیلتے ہوئے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا مجھے۔'' اس وقت اینڈی سے یہی بہانہ بن پڑا تھا۔

''دوبارہ ایسی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔'' مسٹر ہیوبرٹ نے اینڈی کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

اینڈی اپنے باپ کے غصے سے واقف تھا اس لیے اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ رات کا کھانا کھا کر اینڈی ہوم ورک کرنے بیٹھ گیا پر اس کا دماغ اس ایک ہی نقطہ پر اٹک گیا تھا۔ وہ اب تک سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ بچہ آخر اس کبڑے آدمی کے ساتھ اس گھر میں کیوں گیا، اور وہ کبڑا رات ہوتے ہی ایک عام انسان کیسے بن بیٹھا۔ تجسس اب اس کے اعصاب پر حاوی ہو چکا تھا اور اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس کبڑے کی حقیقت جان کر رہے گا۔

جلدی جلدی ہوم ورک ختم کر کے اینڈی سونے کے لیے لیٹ گیا اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگا۔ جلد ہی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اگلی صبح اینڈی سکول کے لیے تیار بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ مسٹر ہیوبرٹ جو ابھی ابھی جاگنگ سے لوٹے تھے اینڈی کے ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

''کل رات سے ایک اور بچہ غائب ہے۔'' مسٹر ہیوبرٹ نے تشویش سے بھرے لہجے میں اینڈی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اینڈی نے نظر اٹھا کر انھیں دیکھا اور واپس ناشتہ کرنے لگا۔

''افسوس ہوا سن کر۔'' مسز سامنتھا نے کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اینڈی! تمھیں اب احتیاط سے کام لینا ہے۔ بلاوجہ گھر سے باہر مت نکلنا۔ اور جتنا ہو سکے اجنبی لوگوں سے دور رہنا۔'' مسٹر ہیوبرٹ اینڈی کو نصیحت کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب چلو میں تمھیں سکول چھوڑ دوں۔

اثبات میں سر ہلاتا اینڈی اٹھ کھڑا ہوا اور بستہ کندھے پر لٹکا کر مسٹر ہیوبرٹ کے ہمراہ سکول کی جانب چل دیا۔ سکول سے چھٹی کے بعد اینڈی سر جھکائے گھر کی جانب چلتا جا رہا تھا۔ اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرتا وہ ارد گرد سے نظر چراتا اپنی رو میں چلتا جا رہا تھا۔ سکول کے کچھ بچوں کی زبانی اسے اس بچے کے بارے میں معلوم ہوا جو پچھلی رات غائب ہوا تھا۔ یہ وہی بچہ تھا جسے اینڈی نے اس کبڑے کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ اینڈی اس بچے کے متعلق تھوڑی بہت معلومات رکھتا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ بچوں کو غائب کرنے میں اس کبڑے آدمی کا ہاتھ ہے۔

اچانک سے اس کا تجسس اسے ستانے لگا۔ گھر جانے کی بجائے وہ سیدھا اس مکان کی جانب چل دیا۔ درختوں کے مابین واقع اس مکان میں کسی ذی روح کا کوئی عمل دخل دکھائی نہیں دیتا تھا۔

کھڑکی پر واقع لوہے کی سلاخ سے لٹک کر اس نے پھر سے اندر جھانکا۔ اندر دھول مٹی کے علاوہ اسے ایک وسیع ہال نما علاقہ دکھائی دیا جہاں سے زیرِ زمین سیڑھیوں کا راستہ جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ لوہے کی ایک لمبی زنجیر ان سیڑھیوں سے نیچے لٹکتی دکھائی دے رہی تھی۔

اینڈی کھڑکی سے اتر کر گھومتا ہوا اس مکان کے آہنی دروازے کے سامنے آ گیا۔ اس نے پوری ہمت جمع کر کے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ نہ کھل سکا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی وزنی چیز دروازے پر اٹکائی گئی ہے۔ اس نے کافی کوشش کی پر ناکام رہا۔ لاچار اس نے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر کچھ دیر وہ یوں ہی بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ پھر مسز سامنتھا کے پاس چلا آیا۔

''ممی! میں کچھ دیر باہر کھیلنے جا سکتا ہوں؟'' اینڈی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں اینڈی تم نے پہلے ہی سکول سے لوٹنے میں کافی دیر کر دی۔ اور اب تم دوبارہ باہر جانا چاہتے ہو۔ تمھیں نہیں لگتا یہ کچھ زیادہ ہو رہا ہے۔'' مسز سامنتھا نے غصہ میں کہا۔

''میں جلدی لوٹ آؤں گا، پکا وعدہ!'' معصوم سی صورت بنائے اینڈی منت سماجت کرنے لگا۔

''بالکل نہیں، چپ چاپ جاؤ اور اپنا ہوم ورک کرو۔'' مسز سامنتھا نے سختی لہجے میں

فیصلہ سنا ڈالا۔

اینڈی منہ بسورتا اپنے کمرے میں چل دیا۔

اپنی کھڑکی سے وہ سورج غروب ہوتا دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اس کبڑے کی حرکات پر غور کر رہا تھا۔

کڑی سے کڑی ملا کر دیکھ رہا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دو ایک گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچا۔ پر اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے اسے فوراً اس مکان میں جانا تھا اپنے ڈیڈ کے ساتھ۔

اینڈی بھاگتا ہوا مسٹر ہیوبرٹ کے پاس گیا۔

''ڈیڈ! مجھے آپ کی مدد چاہیے۔'' اینڈی نے ہانپتے ہوئے مسٹر ہیوبرٹ کو بلایا جو کچھ دیر پہلے لوٹ کر آئے تھے اور بستر پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے تھے۔

''پر ہوم ورک تو کب کا ختم ہو گیا تھا اینڈی۔'' مسٹر ہیوبرٹ نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں ڈیڈ! یہ ایک سیکرٹ مشن ہے۔ ہمیں ان بچوں کو بچانا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ سب کہاں ہیں۔'' اینڈی نے پرجوش ہو کر کہا۔

''اینڈی! ہم کسی اور دن کھیلیں گے ابھی میں بہت تھک چکا ہوں۔'' مسٹر ہیوبرٹ نے آنکھیں موند لیں۔

''پر ڈیڈ!'' اینڈی نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ مسز سمانتھا نے اس کی بات کاٹ ڈالی۔

اینڈی ڈیڈ کو آرام کرنے دو۔ مسز سمانتھا نے کمرے کا لیمپ بجھاتے ہوئے کہا۔

اینڈی منہ بسورے سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

''مجھے اکیلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' اینڈی نے ارادہ کیا اور اپنے سکول کے بستے میں کچھ ضروری سامان اکٹھا کرنے لگا۔ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا وہ مسٹر ہیوبرٹ کے کمرے میں گیا اور ان کے سامان سے اپنے مطلب کے کچھ آلات ڈھونڈنے لگا۔ آخر تھوڑی ہی تگ و دو کے بعد اسے وہ مطلوبہ آلہ مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ سارا سامان اپنے بستے میں اکٹھا کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔

صبح ہوتے ہی اینڈی نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اپنا بستہ کندھے پر لٹکا کر گھر سے باہر چل دیا۔ چلتے چلتے وہ اب اس مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اینڈی نے اپنے بستے سے بیٹری سے چلنے والی چھوٹی سی آری نکالی اور دروازے پر آری چلا کر اسے نیچے سے کاٹنے لگا تاکہ اس کے لیے گزرنے کا راستہ بن جائے۔

دروازے کا ایک چھوٹا پرزہ کاٹنے میں اسے تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ وہ جانتا تھا آج اس کے لیے سکول جانا ممکن نہیں ہوگا۔ پر وہ کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

دروازہ کاٹ کر اس نے آری کو بستے میں رکھا اور وہ ٹوپی نکالی جس میں اس نے ایک بڑی ٹارچ لائٹ ٹیپ سے چپکا رکھی تھی۔ ٹوپی پہن کر اینڈی ایک منجھے ہوئے سپاہی کی طرح مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک ہاتھ میں چھوٹا سا جیبی سائز چاقو تھامے وہ اس وسیع ہال میں چلتا جا رہا تھا۔ یہاں اسے کچرے کے ڈھیر اور جالوں کے علاوہ کچھ خاص نہیں دکھا۔

اب اس کا اگلا ٹھکانہ وہ زیر زمین راستہ تھا جہاں زنجیر لٹک رہی تھی۔

گھبراتے ہوئے اینڈی نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترنے لگا۔ دفاع کے لیے ہاتھ میں چاقو تھام رکھا تھا۔ سیڑھیاں پھلانگ کر وہ نچلی منزل میں آ گیا جہاں سے ایک سرنگ چلتی جا رہی تھی۔ کچھ دور چل کر اسے ایک دروازہ دکھائی دیا جو مقفل تھا۔ اینڈی نے اس تالے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ پھر بستے سے ہتھوڑا نکال کر اس پر ضرب لگائی وہ تالا دوسری ضرب پر ٹوٹ گیا۔

دروازہ دھکیل کر اب اینڈی ایک کمرے میں پہنچ گیا جہاں ایک عجیب سا سماں اس کی دید کا منتظر تھا۔

اس کمرے میں سب گمشدہ بچے بے ہوشی کی حالت میں ایک دوسرے پر ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ کمرے میں ڈھیر سارے کنستر اور خالی ڈبے پڑے تھے۔ وہ کبڑا آدمی دو آدمیوں کے ہمراہ سرنج تھامے اینڈی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

اب اینڈی کچھ کچھ چیزیں سمجھ رہا تھا۔

وہ آدمی جو کبھی ان بچوں کو کرتب دکھایا کرتا تھا ان بچوں کو بہلا پھسلا کر لے جاتا اور یکے بعد دیگرے انہیں سائنسی تجربات کے لیے استعمال کیا کرتا۔ اس کی دی گئی ادویات سے بچے کچھ عرصے کے لیے اپنے سوچنے سمجھنے کی حس کھو دیتے اور یوں وہ انہیں استعمال کرتا رہتا۔ پچھلے تین ہفتوں سے وہ اس علاقے کے کئی بچے غائب کر چکا تھا۔

''بہت انتظار کروایا تم نے۔ لیکن اب تمہاری باری ہے۔'' وہ کبڑا آدمی چہرے پر بھیانک مسکراہٹ سجائے اینڈی کی طرف چلتا آ رہا تھا۔

اینڈی نے خطرہ پاس آتے دیکھا تو اپنا آخری وار کرنے کا سوچا مگر اس سے پیشتر اس آدمی نے اینڈی کو پکڑ لیا۔ اس کا بستہ اچھل کر زمین پر جا گرا اور اینڈی کو گردن سے تھامے وہ آدمی اسے ایک کرسی تک لے گیا۔

اینڈی کو کرسی پر مضبوطی سے باندھ کر وہ انجکشن بھرنے لگا۔ اس کا ارادہ اینڈی کو بے ہوش کرنے کا تھا۔ باقی کی کارروائی اس کے بعد کی جاتی۔

اس سے پہلے کہ وہ انجکشن اینڈی کی رگوں کو چھوتا اسے ایک زوردار ضرب اپنے سر پر محسوس ہوئی اور وہ ایک وار میں دھپ سے گر گیا۔

اینڈی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

''ڈیڈ! آپ نے مجھے ڈھونڈ لیا۔'' اینڈی نے پرجوش ہو کر کہا۔

''ہاں! کیسے نہ ڈھونڈتا تم نے مجھے آج نیویگیشن کا صحیح استعمال بتا دیا پر یاد رہے

بقیہ صفحہ نمبر: 61

1۔ آپا تارہ مزیدار کیک بنا رہی تھیں۔ چچا خواہ مخواہ جگو میاں کو کندھے پر بٹھائے پہنچ گئے باورچی خانے میں۔

''ارے بھئی ایسے نہیں بناتے کیک تارہ! بیکنگ پاؤڈر تھوڑا ہے ایک چمچ بھر کر ڈالو۔''

''چچا! خراب ہو جائے گا کیک'' آپا تارہ بولیں۔

''ارے! ڈالو ڈالو'' ایک کی بجائے دو چمچ ہی ڈال دیے چچا نے۔

''ارے چچا! سارا کیک خراب ہو جائے گا۔'' آپا تارہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔''

''اتنا مزے دار کیک کبھی کسی نے نہیں کھایا ہو گا دیکھتے جاؤ۔''

چچا خواہ مخواہ پُر جوش تھے۔

چچا خواہ مخواہ اور جگّو میاں

چچا خواہ مخواہ نے منائی الف نگر کی سالگرہ

عائشہ اطہر

2۔ اوون سے کیک کا عجیب سا ملغوبہ نکلا۔

''خراب ہو گیا نہ کیک الف نگر کی سالگرہ میں جانے کا وقت کم ہے اور کیک بنانے کا اور سامان بھی نہیں۔'' آپا تارہ رو دینے کو تھیں۔

''ارے! باہر نکلو باورچی خانے سے اور دیکھو میرا کمال'' چچا چہکے۔

''دیکھ لیا ہے آپ کا کمال چچا! سارے کیک کا کسٹرڈ بنا دیا آپ نے۔'' آپا تارہ پریشانی سے بول رہی تھیں۔

''خواہ مخواہ اتنا بیکنگ پاؤڈر ڈال کر سارا کیک خراب کر دیا۔ سب سامان بھی ضائع ہو گیا۔'' آپا تارہ چچا سے ناراض ہو گئیں۔

3۔ ’’کیا بن رہا ہے چچا؟‘‘ جگنو میاں چلایا۔

’’گلاب جامن‘‘ چچا خواہ مخواہ چہکے۔

’’یہ گلاب جامن ہیں‘‘ آپا تارہ کی حیرت بھری چیخ نما آواز نکلی۔ شیشے کے ڈونگے میں خربوزے جتنے بڑے بڑے دو گلاب جامن شیرے میں تیر رہے تھے۔

’’جی ہاں‘‘ بالکل گلاب جامن ہیں۔ آج تک کاٹے ہیں کسی نے سالگرہ پر گلاب جامن؟ کیا عمدہ خیال ہے میرا سب داد دیں گے۔‘‘ چچا خوشی خوشی بولے۔

’’یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کہ کون داد دیتا ہے اور کون مذاق اُڑاتا ہے۔‘‘ آپا تارہ نے چچا خواہ مخواہ کو جواب دیا۔

’’سب داد دیں گے اور میرے مزے دار گلاب جامنوں کی تعریف بھی کریں گے۔ کوئی مذاق نہیں اُڑائے گا۔‘‘ چچا کی خود اعتمادی عروج پر تھی۔

4۔ ’’ضروری تو نہیں کے خوشی کے موقع پر صرف کیک ہی کٹے، عید بھی ہے اور الف نگر کی سالگرہ بھی اس بار عید کی خوشی اور الف نگر کی سالگرہ پر کیک کی بجائے گلاب جامن کاٹیں گے۔‘‘ چچا خواہ مخواہ نے اعلان کیا۔

چچا خوب تیار ہو کر جگنو میاں اور آپا تارہ کے ساتھ الف نگر پہنچے۔

آپا تارہ بھی خوب بنی سنوری ہوئی تھیں۔ بالوں میں پھول ہاتھوں میں چوڑیاں اور نئے کپڑے سب کی شان ہی نرالی تھی۔

الف نگر کے سامنے پہنچ کر جگنو میاں خوشی سے چلائے:

’’آہا! پہنچ گئے الف نگر۔‘‘

الف نگر میں سب نے چچا خواہ مخواہ، جگنو میاں اور آپا تارہ کو خوش آمدید کہا۔

سب الف نگر والوں نے پہلے اتنے بڑے بڑے گلاب جامن دیکھ کر قہقہے لگائے اور پھر خوب مزے سے گلاب جامن اُڑائے۔

آئے تن کی تتلی

آخری قسط

حنیف ملک

ہوا میں اڑتا قالین اب ان کے شہر سے بہت دور پہنچ چکا تھا۔ انھیں اب دور کسی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ قالین ایک پہاڑ کی اوٹ میں جا کر رک گیا۔ آئے تن نے دیکھا کہ وہ ایک قدیم زمانے کی خوبصورت بستی تھی۔ لوگ معمول کے مطابق کاموں میں مصروف تھے۔ بستی چاروں طرف سے خوبصورت اور سرسبز پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔

''آئے تن کیا تم اپنے پہلے امتحان کے لیے تیار ہو؟''

پری نے آئے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

''ہاں میں تیار ہوں''

آئے تن کچھ خوف زدہ تھی کیونکہ یہ سب اس کے لیے نیا مگر دلچسپ تھا۔

''ٹھیک ہے آئے! اب تم میرے سامنے بیٹھ جاؤ''

آئے قالین زری پری کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ زری نے اپنی چھڑی گھمائی تو آئے منظر سے غائب ہو گئی۔

یہ منظر ایک شاہی دربار کا تھا۔ سامنے ہیرے جواہرات سے بنا ایک خوبصورت تخت تھا جس پر دو دربان کھڑے ملکہ عالیہ کو پنکھا جھل رہے تھے۔ تخت پر بڑے ہی وقار سے ملکہ آئے تن براجمان تھی، خوبصورت اور بیش قیمت لباس پہنے سر پر خوبصورت سونے کا تاج سجائے۔ اچانک دربار کے داخلی دروازے سے ہلکے ہلکے شور کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو سب اس طرف متوجہ ہو گئے دو آدمی ملکہ سے بات کرنے کے لیے بضد تھے لیکن دربان ان کو اندر آنے سے روک رہے تھے۔

ملکہ نے ان دونوں کو اندر بلانے کا حکم دیا تو دربان نے رستہ چھوڑ دیا۔ ایک شخص اپنے حلیے سے کافی غریب لگ رہا تھا جبکہ دوسرا امیر۔ ان میں سے ایک نے بولنا شروع کیا:

''آداب ملکہ عالیہ! میرا نام منصور ہے۔ میں ایک غریب چرواہا ہوں۔ بمشکل بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے چند اشرفیاں کماتا ہوں۔ ملکہ عالیہ! کل شام کے وقت میرے ریوڑ سے دس بکریاں غائب تھیں۔ میرے بہت ڈھونڈنے کے بعد وہ اس شخص سے ملیں لیکن یہ عبدالغفور مجھے میری بکریاں لوٹانے سے انکار کر رہا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ یہ بکریاں اس کی اپنی ہیں جبکہ ہم میں سے کسی نے بھی کبھی اس کے پاس کوئی بکری نہیں

دیکھیں۔ براہ مہربانی ملکہ عالیہ! حق کے مطابق فیصلہ کر دیجیے۔ میں غریب انسان ہوں۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی روزگار نہیں۔''

منصور نے ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی۔

ملکہ نے دوسرے شخص کی طرف دیکھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اپنا مدعا پیش کرے۔

''ملکہ عالیہ! اس شخص کی بکریاں کہاں گئیں مجھے نہیں معلوم۔ ہاں، لیکن میں کل یہ دس بکریاں شہر سے خرید کے لایا ہوں۔''

ملکہ سوچ میں پڑ گئی۔ کافی سوچ بچار کے بعد گویا ہوئی:

''دونوں کی باتیں سننے کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچی ہوں کہ یہ بکریاں عبدالمنصور کی ہیں اور اسی کے حوالے کر دی جائیں۔''

''لیکن ملکہ عالیہ!''

''بس!''

ملکہ سختی سے بولیں:

''میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔''

دربان فوراً دونوں کو پکڑ کر باہر لے گئے۔

دور کھڑی زرنگار پری کا چہرہ کھل گیا۔ تو کیا آئے تن اس کے پرستان نہیں جا سکے گی؟ زری نے آئے کو کہتے سنا۔

''ان دونوں کے ساتھ ایک ایک سپاہی بھیجو اور مجھے ان کے حالات کی آگاہی دیتے رہو۔''

زری کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ یہ آئے تھی، دل کی صاف اور رحم دل۔ یقیناً یہ ہر امتحان سے گزرے گی۔

اگلے دن بستی کے داخلی دروازے سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ اس بات کا عندیہ تھا کہ کوئی قافلہ بستی میں داخل ہوا ہے۔

دربان نے ملکہ کو خبر دی کہ آموں کے جزیرے سے ایک بہت بڑا قافلہ آیا ہے اور وہ ملکہ آئے تن سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ ملکہ نے ان کو اندر بلانے کا کہا۔ کچھ دیر بعد دربار میں ایک نہایت باوقار شخص داخل ہوا جس نے نہایت قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا اور ہاتھوں میں آموں کی ایک ٹوکری پکڑ رکھی تھی۔ اپنے حلیے سے وہ آموں کے جزیرے کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ ٹوکری کو دربان کے حوالے کر کے ملکہ کے سامنے آداب بجا لاتے ہوئے وہ شخص سامنے پڑی سونے کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

''ملکہ عالیہ! مجھے تو آپ جانتی ہی ہوں گی میرا نام سردار امولا ہے۔ میں آموں کے جزیرے کا سردار اعلیٰ ہوں۔ یہ ٹوکری اور اس طرح کی ہزاروں ٹوکریاں آپ کے لیے لے کر آیا ہوں بطور تحفہ۔''

''آپ کا مقصد کیا ہے؟''

آئے تن نے دوٹوک انداز میں پوچھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آموں کی یہ ہزاروں ٹوکریاں بطور تحفہ نہیں تھیں بلکہ وہ ضرور اس کے بدلے کچھ نہ کچھ چاہتے تھے۔

''ہاہاہا! بڑی سمجھدار ہیں آپ ملکہ عالیہ! دراصل یہ بستی نہایت خوبصورت جگہ واقع ہے اور سننے میں آیا ہے کہ اس بستی کے ساتھ ہی سیکڑوں ایکڑ کی زمین ہے جسے آپ لوگ کاشتکاری کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ آپ ہی کی ملکیت ہے۔ ہم وہ زمین منہ مانگی قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم آپ کو عمدہ آموں کی بیج بھی بالکل مفت دیں گے۔ اس نسل کے بیج آپ کو دنیا بھر میں کہیں نہیں ملیں گے۔''

''اور آپ وہ زمین کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟''

''دراصل آموں کے جزیرے کے باسی نہایت جنگجو قسم کے لوگ تھے۔ انہوں نے بہت سے قبائل سے دشمنی پال رکھی تھی۔ یہ ان کے لیے ایک عام حربہ تھا کہ وہ دشمن کے نزدیک ہی وسیع و عریض زمین خرید لیتے اور پھر پوری تیاری سے اس پر وار کر کے دشمن کی سرزمین فتح کر لیا کرتے تھے۔

''آپ جانتی ہیں کہ آپ کی بستی کے ساتھ والی بستی میں خراما نامی قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کے سردار نے ہمیں اپنے دربار سے گزر کر تجارت کرنے کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ وہ امن پسند قبیلہ ہے اور ہم جیسے طاقتور لوگوں سے کوئی معاہدہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اسی لیے ہم نے سوچا کیوں نہ ان کو اپنی طاقت کا چھوٹا سا نمونہ دکھایا جائے۔''

سردار امولا یہ کہتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔ خراما قبیلے کا نام سنتے ہی ملکہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بھلا وہ منافع کے لیے اتنے اچھے دوست اور امن پسند قبیلے کے ساتھ غداری کر سکتی ہے؟ بالکل نہیں! خراما قبیلہ صدیوں سے ان کے ساتھ آباد تھا۔ مالی لحاظ سے تھوڑا کمزور تھا لیکن اخلاقی لحاظ سے بہت پختہ تھا۔ قبیلے کے ملک اور اس کے قبیلے سے بہترین مراسم تھے۔

''نہیں، بالکل نہیں! ہم یہ زمین آپ کو کسی قیمت پر نہیں دے سکتے۔''

آئے تن نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔ سردار امولا کا چہرہ تن گیا۔

''ایک دفعہ پھر سوچ لیں ملکہ عالیہ! یہ ایک بہترین منافع تھا جسے آپ ٹھکرا رہی ہیں۔''

امولا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا:

''میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔''

سردار غصے سے باہر کی طرف چل دیا۔

''سردار رکیں!''

ملکہ کی آواز سنائی دی تو سردار مسکراتا ہوا مڑا۔

بقیہ صفحہ نمبر: 66

ناقابلِ فراموش ایڈونچر

ناہید گل

عمیر اور نجمی کو اس غار میں پناہ لیے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ دونوں تین دن پہلے عادل، شکیل اور وقاص کے ہمراہ ایڈونچر پر نکلے تھے۔ وہ حال ہی میں اپنے دسویں جماعت کے امتحانات سے فارغ ہوئے تھے۔ ان سب نے پہاڑوں پر مہم جوئی کا پروگرام بنا رکھا تھا، اسی لیے انہوں نے ''ایڈونچر ہمارے سنگ'' نامی ایک ادارے سے رابطہ کیا۔ اس ادارے نے انہیں تین دن تک کوہ پیمائی کے لیے ضروری ''ٹریننگ'' دی اور پھر ایک گائیڈ (رضوان) کی نگرانی میں مہم جوئی کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہ سب اس ایڈونچر کے لیے بہت پر جوش تھے۔ انہوں نے براستہ مری نتھیا گلی پہنچنے کے لیے ''ہائیکنگ ٹریکس'' یعنی پیدل سفر شروع کر دیا تھا۔

''یہ میری زندگی کا یادگار ایڈونچر ہوگا۔'' عمیر نے اپنے گروپ کے ساتھ سیلفی لیتے ہوئے کہا۔

''انکل کیا مری اور ایبٹ آباد کے جنگلات میں خطرناک جانور بھی پائے جاتے ہیں؟'' نجمی نے اپنے گائیڈ رضوان سے پوچھا۔

''زیادہ خطرناک جانور تو نہیں البتہ تیندوا پایا جاتا ہے۔''

بھاگو! وہ سامنے تیندوا'' گائیڈ رضوان کے خاموش ہوتے ہی عادل چلایا تو سب لوگ حواس باختہ ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے عادل نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ وہ سب کو بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ موسم اپنے تیور بدل رہا تھا تیز ہوائیں اب طوفانی ہواؤں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ''سب ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لو یہ برف کا طوفان ہے۔ گائیڈ رضوان چلایا۔ طوفان اس قدر شدید تھا کہ ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے کے باوجود بھی وہ سنبھل نہیں رہے تھے۔ گرد و نواح میں درخت یوں ٹوٹ کر گر رہے تھے جیسے وہ کاغذ سے بنے ہوں اچانک چند درخت ٹوٹ کر ان پر بھی گر پڑے ان سب کی چیخیں طوفان کے شور میں ہی دب کر رہ گئی تھیں۔ اسی دوران عمیر اور نجمی اپنے گروپ سے بچھڑ گئے تھے۔ برف کے طوفان نے چند ہی گھنٹوں میں ہر چیز کو ڈھانپ لیا تھا۔ طوفانی ہواؤں نے عمیر اور نجمی کو گہرائی کی طرف اچھال دیا تھا برفانی تھپیڑوں نے انہیں بے حال کر دیا تھا وہ ہوش و حواس میں نہ رہے تھے۔ دوسری طرف درخت اس انداز سے ان لوگوں پر گرے تھے کہ ان پر چھت بن گئی تھی، اللہ تعالی نے انہیں اپنی امان میں رکھا۔ گائیڈ رضوان نے اوسان بحال ہوتے ہی لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ برف کو ہٹاتے رہیں تاکہ برف چاروں طرف سے انہیں ڈھانپ نہ لے۔

"عمیر اور نجمی یہاں نہیں ہیں۔"

اچانک وقاص چیخا تو سب پریشان ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی حفاظت کی دعائیں مانگنے لگے۔ شکیل نے تو باقاعدہ اونچی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ عمیر اور نجمی کو جب ہوش آیا تو انہوں نے خود کو ایک غار کے دہانے پر پایا برف کی ایک دبیز تہہ ان پر چڑھ چکی تھی چونکہ برف ابھی نرم تھی اس لیے تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ برف کی تہہ سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے اس غار میں پناہ لے لی تھی۔ جہاں قدرت انہیں لے آئی تھی۔ عمیر اور نجمی بہت خوف زدہ تھے۔ اگرچہ وہ دونوں مضبوط جسامت کے مالک تھے اور بہادر بھی مگر اس صورت حال نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ اچانک نجمی کو سرخ کپڑے کا خیال آیا، انہیں "ٹریننگ" کے دوران بتایا گیا تھا کہ کسی ناگہانی صورت میں مدد درکار ہو تو اس سرخ کپڑے کو وہاں لہرا دیا جائے۔ اس لیے نجمی نے فوراً سرخ رنگ کے کپڑے کو غار کے دہانے پر ایک چھڑی کی مدد سے لٹکا دیا تھا۔

خوفناک برفانی طوفان تھم چکا تھا گائیڈ رضوان اور بچے عمیر اور نجمی کے لیے بہت پریشان تھے گائیڈ رضوان نے جلدی سے اپنے بیگ میں سے ڈرون کیمرہ نکالا اور اس کی مدد سے عمیر اور نجمی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ڈرون کیمرے میں ہر طرف برف ہی برف دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چیز کو سفید رنگ کی چادر نے ڈھانپ رکھا ہو۔ انہیں کہیں بھی اپنے لاپتہ ساتھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

"دوستو! مجھے قریبی سڑک پر برف میں دھنسی ہوئیں چند گاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ آؤ وہاں چل کر دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے کسی کو مدد کی ضرورت ہو۔" گائیڈ رضوان نے اپنا بیگ پہنتے ہوئے کہا۔

"لیکن عمیر اور نجمی؟" شکیل نے سوالیہ نظروں سے گائیڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم ان شاءاللہ انہیں بھی جلد ڈھونڈ لیں گے فی الحال ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔" گائیڈ رضوان نے تسلی دیتے ہوئے کہا لیکن اندر سے وہ خود بھی بہت پریشان تھا۔

"اچھا دوستو! ایک بات کا دھیان رکھنا اپنی اپنی چھڑی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا اور کچی برف پر چلنے سے گریز کرنا۔" گائیڈ نے ہدایت دی۔ جب وہ لوگ سڑک پر پہنچے تو دیکھا وہاں چار گاڑیاں برف میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں کی وجہ سے ہی سڑک کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ انہوں نے جلدی سے گاڑیوں پر سے برف ہٹانے شروع کر دی گاڑیوں کے اندر موجود لوگ بہت خوف زدہ اور ہراساں تھے۔ جب کہ ایک گاڑی میں موجود چھوٹے بچے مدہوشی کی حالت میں تھے۔ گائیڈ رضوان اور اس کی ٹیم نے اپنے سامان میں سے "فرسٹ ایڈ باکس" نکالے اور سب کو ابتدائی طبی امداد فراہم کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی خوراک میں سے کھانے، پینے کا سامان بھی انہیں مہیا کیا۔

گائیڈ رضوان نے سب مسافروں کو ہدایت کی کہ وہ گاڑیوں کے شیشے پورے بند نہ کریں تاکہ گاڑیوں کے اندر آکسیجن کی کمی نہ ہونے پائے۔ مسافروں نے گائیڈ رضوان اور اس کی ٹیم کا اس مشکل وقت میں مدد کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ گائیڈ رضوان نے ایک بار پھر سے ڈرون کیمرہ کی مدد سے اپنے لاپتہ ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اچانک گائیڈ رضوان چونک پڑا کیونکہ نیچے گہرائی کی طرف سرخ رنگ کا کپڑا دکھائی دے رہا تھا جو اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہاں کوئی مدد کی تلاش میں ہے۔ رضوان نے دل سے دعا کی یہ عمیر اور نجمی ہی ہوں جب وہ ڈرون کیمرہ اس سرخ رنگ کے کپڑے تک پہنچا تو گائیڈ رضوان خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ کیمرے میں عمیر اور نجمی صحیح سلامت نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے بھی ڈرون کیمرہ دیکھ لیا تھا اور جوش سے ہاتھ ہلانے لگے۔ گائیڈ رضوان نے جلدی سے ریسکیو ٹیم کو اپنے لاپتہ ساتھیوں کی "لوکیشن" فراہم کر دی۔ چند گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد ریسکیو ٹیم نے عمیر اور نجمی کو باحفاظت غار سے نکال لیا تھا۔ اس طرح ایک ناقابلِ فراموش ایڈونچر اپنے اختتام کو پہنچا۔ ☆

بقیہ: کبڑا اغواکار

دوبارہ کبھی سکول بنک مت کرنا۔ ورنہ نتائج کافی خطرناک ہوں گے۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟" مسٹر ہیوبرٹ نے بھنویں اچکا کر کہا۔

"ایک فوجی کا بیٹا خطرے سے کیسے ڈر سکتا ہے؟" اینڈی نے مسکرا کر اپنے باپ کو دیکھا جو اسے رسیوں سے آزاد کروا چکے تھے۔

پولیس نے اس آدمی اور اس کے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ بچے جو بے ہوشی کی حالت میں گرے پڑے تھے انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ تھوڑی تگ و دو کے بعد ڈاکٹر ان سب کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک طویل دن کے بعد اینڈی مسٹر ہیوبرٹ کے ساتھ گھر واپس آ گیا تھا۔ کھانے کی میز پر خاموشی سے بیٹھے وہ کھانا کھا رہے تھے۔

اچانک اینڈی نے نظر اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور بولا:

"میں ایک بات اب بھی سمجھ نہیں سکا۔ لوکیشن تو میں نے آن ہی نہیں کی تو آپ وہاں کیسے پہنچ گئے؟" اینڈی نے اپنے باپ کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"شاید تم بھول رہے ہو تم بھی فوجی کے بیٹے ہو اور فوجی کبھی آنکھیں بند نہیں کرتے۔" مسٹر ہیوبرٹ نے آنکھ میچ کر اینڈی کو اشارہ کیا۔

مسز سانتا بھی مسکرا دی جبکہ اینڈی مزید الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ یقیناً ایسی بہت سے راز تھے جن سے اینڈی اب بھی ناواقف تھا۔ ☆

قاتل کون؟

رخشندہ بیگ

سرخ اور نیلی شعاعیں چاروں جانب پھیل چکی تھیں۔ وقفے وقفے سے ہوتے دھماکے، جگہ جگہ سے اٹھتا دھواں، تباہ حالی اور بربادی کا خوفناک منظر پیش کرتی لاشیں جو لیبارٹری کے اندر اور باہر پڑی خوف و دہشت کا باعث تھیں۔

ٹرین پوری رفتار سے چلتی جارہی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے تمام ہی مسافر کمبلوں میں لپٹے پڑے تھے۔ جن کو لیٹنے کے لیے برتھ میسر تھے۔ وہ سفر میں بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے، جب کہ کچھ سیٹوں پر سکڑے سمٹے اونگھتے ہوئے وقت گزار رہے تھے۔

دو نوعمر لڑکے کمبلوں میں دبکے اپنے موبائل فون آن کیے، نیٹ پیکج سے فیضیاب ہوتے، اپنی ہی دنیا میں مگن دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر ان چیخوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

وہ سب اچانک ہی ہوا تھا۔ کیسے اور کہاں سے کوئی سمجھ ہی نہیں سکا کچھ پل ہی لگے تھے، ایک تند و تیز جھونکے کی طرح بوگی کے تمام مسافر زندگی کی قید سے آزاد ہو چکے تھے۔

تباہی و بربادی کا منبع وہ پراسرار وجود اب وہاں کہیں نظر نہ آتا تھا جس پراسرار طریقے سے ظاہر ہوا اسی طرح غائب بھی ہو چکا تھا۔

ملک کے مصروف ترین ہوائی اڈے پر ایک خوف کا عالم تھا۔ تمام پروازیں منسوخ کر دی گئی تھیں۔ فلائیٹ نمبر Ak_47 اڑان بھرنے کے دس منٹ بعد واپس اتار لی گئی تھی۔ ہوائی ڈرائیور، اس ساتھی اور ایک ہوائی میزبان کو لرزتے کپکپاتے وجودوں کے ساتھ ایمبولنس میں ڈال کر طبی عملے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

پورے جہاز پر عملے سمیت لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ جیسے درندوں کی کسی فوج نے حملہ آور ہو کر ہر ذی روح کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ جہاز میں ہر جانب خون ہی خون تھا۔ اس خوفناک منظر کی تاب لانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

سلیم پہاڑی قصبے کا مکین تھا۔ پڑھائی کے لیے قریبی شہر چچا کے گھر پر ہی رہتا، مہینے میں ایک بار دو تین دن کے لیے ماں باپ سے ملنے قصبے کا رخ کرتا۔ مگر اب گزرتے وقت کے ساتھ یہ اس پر گراں گزرنے لگا تھا۔ پہاڑی قصبہ کافی دور دراز تھا۔ وہاں اور بہت سی سہولیات کے فقدان کے ساتھ نیٹ بھی دستیاب نہیں تھا۔ اکثر اوقات تو فون سگنل بھی غائب ہوتے اور کسی سے رابطہ کرنا ممکن نہ رہتا۔

سلیم کو موبائل کی اس قدر عادت ہو چکی تھی کہ اب وہ موبائل میں پیکج کرواتا اور پہلے جو وقت ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزرتا تھا، وہ بھی اب موبائل اور نیٹ کی نذر ہونے لگا۔

گھر میں بھی اس کے آرام کی خاطر اسے الگ کمرہ میسر تھا۔ باقی بھائی دوسرے کمرے میں سوتے تھے۔ ان دنوں سلیم گھر آیا ہوا تھا، مگر اپنی ہی دنیا میں مگن، باپ کو اس

سے بڑی امید تھی۔ اسی وجہ سے اسے اچھی تعلیم حاصل کرنے شہر بھیجا ہوا تھا۔

صبح جب وہ دیر تک کمرے سے باہر نہ آیا تو چھوٹا بھائی اسے بلانے گیا مگر وہاں کا منظر دیکھ کر وہ بے اختیار چیختا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر میں یہ خبر پورے قصبے میں پھیل چکی تھی، سلیم کی لاش نے ہر جانب خوف و ہراس کی فضا قائم کر دی۔ لوگ اسے کسی درندے کی کارروائی سمجھ رہے تھے۔

اسی طرح کے واقعات مختلف مقامات پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک تواتر سے رونما ہو رہے تھے۔ ہر جانب ایک افراتفری پھیلی تھی اور دہشت کا راج تھا۔ لوگ حکومت سے درخواست کر رہے تھے کہ انہیں اس اچانک ہونے والی خوفناک موت سے بچایا جائے۔

اعلیٰ سطح پر خفیہ اجلاس بیٹھ چکا تھا۔ حکومتی ادارے، خاص طور پر حفاظتی ذمے داریوں پر مامور اہلکار شدید دباؤ کا شکار تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ بند کمروں میں اڑتے جہازوں اور چلتی گاڑیوں میں کون سی ایسی طاقت ہے جو انسان کو لمحوں میں درندگی کا نشانہ بنا کر کوئی بھی سراغ چھوڑے بنا غائب ہو جاتی ہے۔

''صمدانی۔۔۔اب ڈاکٹر صمدانی ہی واحد امید ہیں۔''

چیف پولیس نے تمام تر کوشش کے بعد ہار مان لی تھی۔ اجلاس میں شرمندگی سے سر جھکائے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے، مانے ہوئے سائنسدان ڈاکٹر صمدانی کا نام پیش کر دیا تھا۔

متعلقہ وزیر نے غصے سے چیف کی طرف دیکھا۔

''تو تم اپنی اور اپنے محکمے کی نالائقی کا اعتراف کر رہے ہو۔''

''جناب میں اور میرے قابل اہلکار پوری جان لڑا چکے ہیں۔ مگر یہ معاملہ ہمارے بس سے باہر ہے۔''

میٹنگ روم کے باہر ایک فون کال نے سیکٹری کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اچانک وہ اٹھا اور لرزتے قدموں سے میٹنگ روم میں داخل ہو گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے! بغیر اجازت اس طرح آنے کا مقصد؟''

چیف نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔ جواب میں جو سننے کو ملا اس سے وہاں ایک بھونچال آ چکا تھا۔ تمام لوگ لمحوں میں وہاں سے نکلے اور وزیر صاحب کے گھر کی جانب دوڑے، جو اس آفس سے متصل ہی تھا۔

''ایک اور واردات! اف میرے خدا'' چیف نے سر پکڑ لیا۔ اکلوتی بیٹی کے کمرے میں اس کی لاش دیکھ کر وزیر صاحب کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ تمام پرنٹ اور الیکٹرک میڈیا نے یک دم دھاوا بول دیا۔ تلخ سوالات اور عوامی غصے سے بچ کر چیف نے وقتی طور پر راہ فرار حاصل کرنے میں ہی بہتری سمجھی۔

کافی تحقیقات کرنے سے یہ بات تو سامنے آ چکی تھی کہ یہ کسی درندے یا انسان کا کام نہیں ہے۔ ماورائی طاقتوں کی کارروائی لگتی تھی۔ مگر پڑھا لکھا طبقہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کیس پہلے ہی ہنگامی بنیادوں پر انسپکٹر عدنان کے سپرد کر دیا گیا تھا جس کی تحقیق لیبارٹری تک جا پہنچی تھی۔ یہ لیبارٹری چینی سائنس دانوں کے اشتراک سے کام کر رہی تھی۔ یہاں موجود تمام عملہ موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور سارا سسٹم تباہ ہو گیا تھا۔ صرف ڈاکٹر صمدانی جو اس وقت دورہ چین پر گئے تھے وہ باقی تھے۔ مگر کہاں تھے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

درندگی کے یہ واقعات ہر روز بڑھتے جا رہے تھے اور اب تک ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔

''عدنان! یہ آخر کون ہے؟ کیا ہے؟''

چیف نے بے بسی سے دریافت کیا۔

''سر! میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ مگر ابھی تک سراغ نہیں لگا سکا۔ ہاں کچھ ثبوت ملے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے میں بہت جلد اصل مجرم تک پہنچ جاؤں گا۔''

آخر کار سراغ مل ہی گیا کہ اس خوفناک درندگی کے پیچھے کون سی قوتیں کارفرما ہیں۔ ڈاکٹر صمدانی رضاکارانہ طور پر سامنے آ چکے تھے۔ مگر جو وجہ سامنے آئی اس نے سب کو ہلا کے رکھ دیا۔ سرسبز پہاڑوں کے درمیان ایک ویران وادی میں قائم یہ لیبارٹری بہت سے نئے پراجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ ان میں سے ایک پراجیکٹ مقناطیسی لہروں کے ذریعے کچھ ایسی فریکوئنسی پیدا کرتا تھا جو موبائل کے ایک مخصوص سسٹم کو کنٹرول کر سکیں۔

اس تجربے کو چیک کرنے کے لیے ایک مقبول گیم کے سسٹم کو ہیک کر لیا گیا اور یہ خفیہ لہریں اس سسٹم میں داخل کر دی گئیں۔ مگر اس کے نتیجے میں جو خوفناک تباہی برپا ہوئی۔ اس کا شکار سب سے پہلے لیبارٹری کا عملہ ہوا اور اس کے بعد ان قاتل لہروں نے ہر اس شخص کو متاثر کرنا شروع کر دیا، جس نے بھی اس نئے گیم کے ایک مخصوص لیول تک رسائی حاصل کی۔ یہ گیم چوں کہ نوجوانوں میں مقبول ہوا اسی لیے اس کا شکار بھی زیادہ تر نوجوان ہی بن رہے تھے۔

یہ تمام حقائق ڈاکٹر صمدانی کی زبانی سن کر پوری تحقیقاتی ٹیم پریشان بیٹھی ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

آخر کار سب سے پہلے انسپکٹر عدنان کو ہی ہوش آیا اور ڈاکٹر صمدانی سے سوال پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ سب تو بہت خطرناک ہے۔ اس کو اب کیسے روکا جائے گا؟ دوسری بات کہ جب یہ اتنا ہی خطرناک تھا تو اسے فوراً کیوں نہ روکا گیا؟''

''یہ سب اتنا ہولناک نہیں ہوتا مگر مقناطیسی لہروں کی غلط فریکوئنسی اور شدت نے گیم کے سسٹم کے ساتھ منسلک ہوتے ہی کچھ ایسی نیگٹو لہروں کو متحرک کر دیا جن پر ابھی تک سائنس دانوں کا کوئی بھی کنٹرول نہیں ہے۔''

"آپ کو جب اس سب کے بارے میں علم تھا تو آپ اتنے دن غائب کیوں رہے؟"

ایک اور رکن نے تنگی سے سوال کیا۔

"میری موجودگی میں ہی یہ تجربہ کیا گیا تھا اور مجھے جیسے ہی اس گڑبڑ کا علم ہوا میں اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش میں لگ گیا اور اس کے لیے میں بیرونِ ملک اپنے دوست ڈاکٹر جوزف کے ساتھ مل کر اس کا توڑ ڈھونڈ رہا تھا۔ دوسرا لیبارٹری کی تباہی کی اطلاع ملتے ہی ہم نے ہر ممکن تیزی سے اس گیم سوفٹ ویئر کو بلاک کروانا شروع کر دیا تھا، مگر افسوس کہ پھر بھی اس پر قابو پاتے پاتے بھی اندازے سے زیادہ نقصان ہو گیا۔"

"آپ اس کے متعلق آگاہی مہم بھی تو چلا سکتے تھے۔"

انسپکٹر عدنان نے پھر سوال اٹھایا۔

"ہم اس خبر کو بالکل بھی باہر نہیں نکال سکتے تھے۔ یہ اطلاع اگر شرپسند عناصر کو مل جاتی تو آپ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کس قدر تباہی برپا ہو سکتی تھی۔"

"بہرحال میرے تمام ساتھی اس غلطی کا خمیازہ بھگت چکے ہیں اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اس کے ساتھ ہی مجھے بے حد افسوس ہے کہ بے شمار بے گناہ بچے اور نوجوان ان قاتل لہروں کا شکار ہو گئے۔ مگر اب میں آپ سب کو یہ ہی خوش خبری دینے سامنے آیا ہوں کہ ہم نے ان قاتل لہروں پر 99% قابو پالیا ہے۔"

"یعنی ایک فیصد خطرہ اب بھی موجود ہے!"

کئی اراکین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ڈاکٹر صمدانی نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا:

"آپ لوگ 99 کے عدد پر غور کیجیے۔"

اس طرح ایک فیصد خطرے کے امکان کے ساتھ یہ میٹنگ اختتام پر پہنچی۔ ☆

صبح اٹھنا

رفعت شمریز

صبح سویرے اٹھا کرو
باغ کی سیر کو جایا کرو

صبح کے کام میں برکت ہے
دن اللہ کی رحمت ہے

صبح سویرے جو اٹھتے ہیں
دن بھر خوش وہ رہتے ہیں

رات کو جلدی جو سو جائے
صبح بھی جلدی وہ اٹھ جائے

وقت پہ جو اٹھ جاتے ہیں
کام سب ہی، ہو جاتے ہیں

جلدی اٹھنا جلدی سونا
وقت اپنا کبھی نہ کھونا

چچا خیراتی اور چالاک نائن

حسن اختر

چچا خیراتی کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ گاؤں کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ تاہم اتنی شہرت کے باوجود ان کا اصل نام کم لوگ ہی جانتے تھے۔ پرلے درجے کے مفت خور اور کنجوس تو تھے ہی۔ سیر پر سوا سیر یہ تھا کہ چچا بسیار خور بھی تھے۔ مفت اور بسیار خوری کے لیے ہمیشہ پرائے گھر کا انتخاب کرتے تھے۔ کنجوس ایسے ہیں کہ اپنے گھر میں کفایت شعاری اور بھوک سے کم کھانے کے اصول اپنا رکھے ہیں۔ ان اصولوں کی پابندی چچا نا صرف خود کرتے ہیں بلکہ بیوی بچوں پر بھی لاگو تھے۔ مگر جب گھر دوسرے کا ہو تو تمام قواعد و ضوابط بھول جاتے تھے۔ شادیوں کے علاوہ خیراتوں میں بھی چچا خوب کسر نکالتے تھے۔ شاید وجہ تسمیہ بھی یہ ہی تھی۔

چچا خیراتی اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر جاتے رہتے تھے۔ وہ جب بھی شہر جاتے تو اپنے دوست راجا نائی کے مہمان ہوتے تھے۔ راجا مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کی بیوی رانی کو چچا خیراتی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ رانی کو چچا خیراتی کی بسیار خوری سے شکایت تھی۔ اگرچہ وہ ایک چالاک عورت تھی۔ مگر شوہر کی فرمانبرداری میں خاموش رہتی تھی۔ رانی روٹیاں پکا پکا کر تھک جاتی تھی مگر کھا کھا کر چچا کا جی نہیں بھرتا تھا۔ چچا حسب معمول راجا کے مہمان ہوئے۔ راجا کا تعلق شہر سے تھا اور وہ چچا خیراتی کے گاؤں میں حجام کا کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی رانی عموماً کسی شادی کے موقع گاؤں جاتی تھی۔ وہ کھانا پکانے اور گھریلو کاموں میں خواتین کی معاونت کرتی تھی۔ رانی نے نہ چاہتے ہوئے بھی چچا خیراتی کے لیے مزے دار کھانا پکایا۔ اور چچا نے آنے والے دو تین دنوں کا راشن گودام نما پیٹ میں خوب اچھی طرح ذخیرہ کیا۔ اس کے بعد چچا خیراتی شہر والا کام مکمل کرنے کے بعد گاؤں والی بس میں آ بیٹھے۔ ایک ایک کر کے سواریاں آ رہی تھیں۔ جب بس بھر گئی تو گاؤں کی سڑک پر چل پڑی۔ اتفاق سے رانی نائن بھی اسی بس میں سوار ہو گئی۔ کنڈیکٹر نے کرایہ لینا شروع کیا تو رانی نے قریب کی سیٹ پر بیٹھے چچا خیراتی کی خوشامد شروع کر دی۔ چچا اس معاملے کو سمجھ تو گئے مگر جب انھوں نے دائیں بائیں

دیکھا تو بہت سے واقف لوگ ان پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ چچا مجبور ہو گئے۔ حاتم حائی کی قبر کو لات مارتے ہوئے انہیں رانی کا کرایہ دینا پڑا۔ اگرچہ بعد میں کئی ہفتوں تک چچا خیراتی کو اس بات کا افسوس رہا۔

کچھ دن بعد چچا کسی کام کی غرض سے دوبارہ شہر گئے۔ حسب معمول مین دوپہر کے وقت چچا خیراتی نے راجا نائی کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ چچا کی بدقسمتی دیکھیے کہ اس بار راجا گھر موجود نہیں تھا۔ رانی نے دروازہ کھولا۔ چچا خیراتی بلند آواز میں بولے۔

''کیسی ہو رانی بھابھی؟''

''کون رانی؟ کیسی بھابھی؟ اجنبی! میں آپ کو نہیں جانتی۔ ضرور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' چالاک نائن نے جواب دیا اور جھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ چچا خیراتی نے ادھر ادھر دیکھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ کسی نے انہیں دیکھا نہیں ہے تو کھسیانے سے ہو کر واپس چل پڑے۔ وہ رانی کی اس حرکت کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ دراصل رانی نائن چچا خیراتی سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا اگر اس شخص کو رسمی طور پر بھی کھانے کا پوچھا تو پھر گھر میں پڑے آنے کی خیر نہیں۔ چچا خیراتی بے بس ہو کر رہ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ رانی نائن مکر گئی ہے اور اوپر سے وہ بے بھی خاتون۔ چنانچہ وہ مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر لیے کر چلتے بنے۔ مگر دل ہی دل میں وہ سوچ رہے تھے کہ ''اس بے عزتی کا بدلہ کیسے لوں گا؟'' چچا خیراتی کے ٹل جانے پر رانی نائن خوب خوش ہوئی۔

خدا کی کرنی کچھ اس طرح ہوئی کہ چند دن بعد راجہ نائی فوت ہو گیا۔ اس کے گھر کا چولہا گاؤں والوں کی طرف سے ملنے والے غلے سے چل رہا تھا۔ حجامت کے بدلے گاؤں والے مل کر اس کو سال بھر کا اناج دیتے تھے۔ راجا کی وفات کے بعد ساری ذمہ داری رانی پر آن پڑی۔ اتفاق سے ان دنوں چچا خیراتی گاؤں کے کونسلر منتخب ہو چکے تھے۔ گرمیوں کی ایک دوپہر کو چچا ایک بڑے درخت کے سائے تلے چوپال سجائے بیٹھے لوگوں کے مسئلے سن رہے تھے۔ اتنے میں ایک خاتون اور ایک نوجوان حاضر ہوئے۔ جب قریب پہنچے تو چچا خیراتی نے پہچان لیا۔ وہ راجا مرحوم کی بیوہ رانی نائن اور اس کا بیٹا رانا تھا۔ رانی نے چچا خیراتی سے درخواست کی کہ باپ کے انتقال کے بعد اس کی جگہ میرا بیٹا گاؤں میں کام جاری رکھنا چاہتا ہے۔ چچا خیراتی کچھ لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔ آج اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا سنہری موقع ہاتھ آیا ہے۔ رانی نے تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں نہ آج میں اس کو جواب دے دوں کہ تم تو کسی جانتی نہیں ہو۔ پھر کام کیسے کرو گی؟ اور اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے گاؤں کے لیے کوئی اور حجام رکھ لوں۔ مگر اگلے ہی لمحے چچا خیراتی کے ضمیر نے ملامت کی کہ تمہارے سامنے اس وقت تمہارے مرحوم دوست کی بیوہ کھڑی ہے۔ کیا تم بھول گئے ہو رانی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ بدتمیزی کی تھی اور راجا نے درجنوں بار تمہاری مہمان نوازی کی تھی۔

رانی نے چچا خیراتی کو سوچ میں گم دیکھا تو معاملہ بھانپ گئی۔ وہ منمنائی۔

''بھائی! معذرت چاہتی ہوں مم مم میں نے۔''

''بس بس شرمندہ نہ کریں بھابھی! رانا میرے مرحوم دوست کا بیٹا ہے اور گاؤں میں حجامت کا کام اس کا حق ہے۔'' چچا خیراتی کے منہ سے یہ بات سن کر رانی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ خوشی خوشی گھر لوٹ گئی۔ ☆

بقیہ: آئے تن کی تھی

''یہ آموں کی ٹوکری اپنے ساتھ لیتے جایئے، سردار امولا!''

ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو سردار کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اتنے میں دربار میں دو سپاہی داخل ہوئے اور انھوں نے ملکہ کو بتایا کہ وہ دس بکریاں دراصل منصور کی تھیں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد منصور عبدالغفور کے پاس گیا اور اس سے منتیں کرنے لگا کہ وہ خدا کا خوف کھائے اور اسے اس کی بکریاں واپس کر دے لیکن عبدالغفور نے اسے حقارت سے دھتکار دیا۔ ملکہ نے دونوں کو بلوایا۔

عبدالغفور کو تین ماہ تک قید کی سزا سنائی گئی اور ساتھ ساتھ بھاری جرمانہ بھی کیا گیا کیونکہ اُس نے چوری کے ساتھ جھوٹ بھی بولا تھا اور منصور کو اس کی بکریوں کے ساتھ ساتھ سونے کی اشرفیاں بھی دی گئیں۔ ملکہ اب پرسکون ہو کر آرام کے لیے چل دیں۔

اتنے میں منظر بدل جاتا ہے۔ اُڑن قالین پر ننھی آئے تن اپنی آنکھیں مسل رہی ہے اور پری مسکرا رہی تھی۔

''مبارک ہو آئے تن! تم نے پہلا امتحان پاس کر لیا ہے۔ یہ امتحان تمہارے اختیار اور اثر کا امتحان تھا۔ تمھیں طاقت دے کر تمہارے انصاف کو جانچا گیا اور تم کامیاب ہو گئی آئے تن۔''

آئے نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بستی کے لوگ ہاتھ ہلا کر ننھی آئے کو رخصت کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ دور چلے گئے۔ آئے مسکرائے گی۔

☆......☆......☆

مختصر کہانیاں

امّی ابّو عید مبارک

محمد رمضان شاکر

آنکھ کھلتے ہی مہک ہڑبڑا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور کچن کی طرف دوڑ لگا دی۔

''السلام علیکم امّی جان!'' مہک نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام پیاری بیٹی!'' امّی جان نے آگے بڑھ کے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

''امّی جان! میں آپ سے ناراض ہوں۔ جائیے میں نہیں بولتی آپ سے۔'' مہک نے روٹھنے والے انداز میں کہا۔

''وہ کیوں بھلا؟ ذرا پتہ تو چلے ہماری پیاری بیٹی کیوں ناراض ہے ہم سے؟'' امّی نے پیار سے کہا۔

''امّی! مجھے کیوں نہیں اٹھایا آپ نے۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ عید والے دن مجھے جلدی اٹھا دیجیے گا۔'' مہک منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''امّی کی جان! مجھے کچن کا کام کرنا تھا اور ویسے بھی ابھی کافی ٹائم رہتا تھا صبح ہونے میں تو اس لیے نہیں اٹھایا۔ تم اپنے کمرے میں چلو میں ابھی آئی کام ختم کر کے۔'' امّی نے پیار سے کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر میں امّی بھی آ گئیں۔ انہوں نے اسے نہلا دھلا کے خوب اچھی طرح تیار کیا۔ تیار ہو کے مہک بالکل شہزادی لگ رہی تھی۔ امّی نے پیار سے اس کی بلائیں لیں اور نظر اتاری۔ خود بھی تیار ہوئیں اور پھر ابّو مسجد اور انہوں نے عورتوں کے لیے مخصوص جگہ پہ نمازِ عید ادا کی۔

''ابّو! میری عیدی تو دیں۔'' گھر آتے ہی اس نے اپنے ابّو کو گھیر لیا۔

''ارے! وہ تو میں بھول ہی گیا۔ یہ لو اپنی عیدی!'' ابّو نے سو سو کے دس کڑ کڑے نوٹ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ابّو! میں ابھی آئی۔'' مہک نے روپے پکڑتے ہوئے کہا۔

''ارے بیٹا! کہاں جا رہی ہو؟ عید مبارک تو بول دو امّی ابّو کو۔'' ابّو اسے پکارتے ہی رہ گئے اور مہک یہ جا وہ جا۔

''ارے بیٹا! کہاں چلی گئیں تھیں آپ؟ اور آپ نے عید مبارک بھی نہیں بولا کسی کو۔'' جیسے ہی وہ واپس آئی امّی نے گھیر لیا۔

''امّی! میں اپنا فرض ادا کرنے گئی تھی۔'' مہک نے معصومیت سے جواب دیا۔

''فرض کیسا فرض؟'' امّی حیرانگی سے بولیں۔

''امّی! وہی فرض جس کا حکم ہمیں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے دیا ہے کہ اپنی خوشیوں میں غریبوں کو بھی شامل کریں۔ اور میں یہی فرض ادا کر کے آئی ہوں۔ میں نے اپنی عیدی کے سارے پیسے بابا شوکت جو محلے میں گھوم پھر کے غبارے بیچتے ہیں اُن کے بچوں میں بانٹ دیے ہیں۔''

''شاباش! میری بچی اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔ آپ نے بہت ہی اچھا کام کیا ہے۔'' امّی ابّو نے آگے بڑھ کے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''اور میری طرف سے اسی خوشی میں ایک ہزار روپے عیدی کے مگر پہلے عید مبارک بولو!'' امّی نے ہزار کا نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

''امّی ابّو عید مبارک!'' مہک زور سے بولی تو سارے گھر میں خوشیوں کے رنگ بکھرتے چلے گئے۔

ایڈونچر پہ ایڈونچر

سمیعہ علی میمن

منان کو ہر چیز میں ایڈونچر ڈھونڈنے کا بڑا شوق تھا۔ جب اس کے بابا نے اسے الف نگر کے جنگل والی جھیل سے مچھلیاں پکڑنے کے لیے چلنے کو کہا تو وہ ایک دم پرجوش ہو گیا۔

''پہلی دفعہ مچھلیاں پکڑنا تو ایک ایڈونچر ہوگا۔'' بابا منان کی بات سن کر ہنس پڑے۔

''ہاہاہا..... تو پھر اس ایڈونچر پہ چلیں؟''

''بالکل! نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

......☆......

منان بابا کے ساتھ الف نگر کے جنگل پہنچا تو وہاں کے خوبصورت اور مختلف میوہ جات کے درخت دیکھ کر وہ جنگل کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

''بابا! الف نگر کا جنگل تو بڑا خوبصورت ہے۔'' بابا منان کی بات سن کر مسکرائے۔

''کیوں کہ یہ کوئی عام جنگل نہیں۔''

''وہ تو نظر رہا ہے۔'' منان بابا کے ساتھ چلتے چلتے جھیل پر پہنچا تو جھیل کے پاس آم کا درخت تھا، جس میں تازہ تازہ پیلے رسیلے آم دیکھ کر منان کا منہ پانی سے بھر گیا تو وہ بابا سے بولا۔

''بابا! کیا میں یہاں سے آم لے سکتا ہوں؟''

''بالکل اُسے چکھتے ہو مگر اس کی تمھیں بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔''

''وہ کیسے؟''

''اُدھر دیکھو تمھیں وہ دو بندر نظر آ رہے ہیں اس درخت پر ان دونوں کا قبضہ ہے۔ جو کوئی بھی اس درخت سے آم کھاتا ہے وہ اس کی اچھی خاصی شامت لاتے ہیں۔''

''یعنی بندروں سے لڑائی پھر یہ تو میرے لئے ایڈونچر پہ ایڈونچر ہو جائے گا۔''

''سوچ لو، وہ بندر بڑے ہی شرارتی ہیں۔'' بابا نے منان کو خبردار کیا۔

''تو کیا ہوا میں بھی کوئی کم شرارتی تھوڑی ہوں۔'' منان نے فخر سے کہتے ہی درخت سے ایک آم لیا اور مزے سے کھانے لگا۔ بابا اپنے سامان میں سے فشنگ راڈ نکالنے لگے۔ تب ہی دونوں شرارتی بندر وہاں پہ آ پہنچے۔ دونوں ان کے سامان سے فشنگ راڈز نکال کر بھاگ گئے۔ ''پکڑ کر دکھاؤ، پکڑ کر دکھاؤ۔'' بندر منان اور اس کے بابا کا منہ چڑانے لگے۔

''منان! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اس آم کھانے کے چکر میں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''بابا! آپ پریشان نہ ہوں بس ان بندروں کو نظر انداز کر کے ایسے باور کرائیں جیسے وہ فشنگ راڈز ہمارے لئے بالکل بے کار ہیں پھر دیکھنا خود ہی یہاں چھوڑ کر جائیں گے۔''

''تم کہہ رہے ہو تو ایسا کر کے دیکھتے ہیں۔ جب تک ایسا ہو تب تک ہم اس کشتی پہ جھیل کی سیر کر آتے ہیں۔'' بابا نے جھیل کنارے کھڑی کشتی کی طرف اشارہ کیا تو منان ان کے ساتھ کشتی کی طرف چل دیا اور وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے جھیل کی سیر کو چل پڑے۔ ابھی تھوڑا سا راستہ ہی کٹا تھا جب وہ شرارتی بندر جھیل میں تیرتے ہوئے کشتی چلاتے منان کے بابا کے چہرے پر پانی مارنے لگے جس کے باعث منان کے بابا توازن برقرار نہ رکھ سکے تو بندر ان سے بوٹ ڈرائیورز چھین کر اڑن چھو ہو گئے۔ اب منان اپنے بابا کے ساتھ جھیل کے بیچ و بیچ اللہ میاں کے رحم و کرم پر کشتی پر سوار تھے جو ادھر سے ادھر ڈول رہی تھی۔ ایسے میں وہاں تین جنگلی بھالوں کا گزر ہوا تو ان میں سے ایک بھالو کی نظر ان پر پڑی۔

''ارے! وہ دیکھو جھیل میں کشتی ڈوب رہی ہے۔'' اس کی بات پر باقی دونوں بھالوں نے تجویز پیش کی۔

''چلو چل کر بچاتے ہیں۔''

بھالوں نے بڑے جتن کر کے منان اور اس کے بابا کو بچا لیا تو منان اور اس کے بابا نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ بندروں نے فشنگ راڈز ان کے سامان میں پھینک دی تھیں۔ ان فشنگ راڈز کو استعمال میں لاتے ہوئے منان اور اس کے بابا نے کچھ مچھلیاں پکڑیں جن میں سے تین مچھلیاں ان بھالوں کو دیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔

''بابا! آج تو ایڈونچر پہ ایڈونچر ہو گیا۔'' واپسی پر منان نے تبصرہ کیا تو بابا ہنس پڑے۔

''تم بھی تو یہی چاہ رہے تھے ایڈونچر پہ ایڈونچر۔''

دوستی کا بھرم

ندا، آمنہ اور ردا تین بہترین دوستیں تھیں جو چوتھی جماعت میں پڑھتی تھیں۔ اُن کی دوستی مثالی تھی پڑھنے لکھنے میں ایک دوسرے کی ہمیشہ مدد کرتیں تھیں اور کلاس میں ہمیشہ اچھے گریڈ لاتی تھیں۔ ان کے سکول میں ایک پروگرام ہونے والا تھا جس میں ہمیشہ کی طرح ان تینوں دوستوں نے حصہ لیا۔ ندا اور آمنہ کی آواز کافی اچھی تھی۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سکول کے ہر پروگرام میں سناتی تھیں۔ مگر اس بار ان کی ٹیچر نے کہا کہ ندا یا آمنہ دونوں میں سے صرف ایک ہی بچہ حصہ لے سکتا ہے۔ اس لیے وہ دونوں آپس میں مشورہ کر لیں کہ کون حصہ لے گا اور کون نہیں۔

ندا اور آمنہ دونوں ہی پروگرام میں حصہ لینا چاہتی تھیں اس لیے دونوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ تو ان کی ٹیچر صبا نے کہا کہ تم دونوں اپنا اپنا نغمہ تیار کرو، جس کا نغمہ زیادہ اچھا ہو گا وہ پروگرام میں حصہ لے گا۔ ندا اور آمنہ نے چیلنج قبول کر لیا پر ان سب چیزوں میں ردا کی شامت آ گئی تھی۔ آمنہ اور ندا بار بار ردا کو اپنا نغمہ سناتی اور اس سے پوچھتی کہ کس کا نغمہ زیادہ اچھا ہے۔ ردا کی تو وہ دونوں سہیلیاں تھیں۔ ایک کی طرف داری کر کے دوسری کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ردا نے ان سے چھپنا شروع کر دیا۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

ردا آمنہ کے گھر آئی ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ندا بھی وہی آ پہنچی اور بولی:

''تم یہاں پر ہو اور میں تمہارے گھر پر تمہارا انتظار کر رہی تھی؟'' ردا بولی:

''ہاں، وہ آمنہ کو میری مدد کی ضرورت تھی اس لیے میں اس کی مدد کرنے آئی تھی۔''

ندا: ''بہت مدد کر لی تم نے اس کی! اب میرے ساتھ چلو اور میرا تیار کیا نغمہ سنو اور بتاؤ کیسا ہے۔''

آمنہ بولی: ''ردا کہیں نہیں جائے گی۔'' ندا اور آمنہ نے لڑنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ردا کو بازو سے پکڑ کر اپنی اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ ردا نے غصے سے اپنے بازو چھڑائے اور بولی۔

''میں تم دونوں میں سے کسی کی دوست نہیں۔'' اور وہاں سے چلی گئی۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' ندا نے آمنہ سے کہا۔ ان دونوں نے پھر لڑنا شروع کر دیا۔ آمنہ کی بہن اقرا جو اتنے دن سے یہ سب دیکھ رہی تھی بولی:

''یہ تم دونوں کی وجہ سے ہوا ہے تم دونوں نے ردا کو ناراض کیا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں بے چاری ردا کو تکلیف دے رہی ہو۔ کہاں گئی تم لوگوں کی مثالی دوستی؟ ایک فنکشن کو لے کر تم دونوں جھگڑنے لگ گئی ہو۔ میری پیاری بہنو! یہی اگر تم دونوں مل کر ایک ساتھ اپنا نغمہ تیار کرتیں تو کوئی بھی ناراض نہ ہوتا۔ ایک

دوسرے کی مدد سے تم لوگ زیادہ اچھا نغمہ تیار کرتی اور ردا ناراض بھی نہ ہوتی۔ مل جل کر کام کرنے سے کام بہت اچھا ہوتا ہے اور جلدی بھی، کیسی؟'' ندا اور آمنہ نے اپنی غلطی مانی اور ایک دوسرے کو سوری کہا۔

ندا بولی: ''تمہاری آواز زیادہ اچھی ہے۔ تم حصہ لے لو پروگرام میں۔''

آمنہ بولی: ''اور تم لکھنے میں اچھی ہو۔ سچ کہوں تو کچھ بھی صحیح نہیں لکھا جا رہا تھا۔''

''ندا! چلو مل کر کام کرتے ہیں۔ ردا کو سرپرائز دیتے ہیں۔'' پروگرام والے دن آمنہ جب اپنا نغمہ سنا کر دینے آئی تو اس نے کہا:

''یہ خوبصورت نغمہ میری دوست ندا نے لکھا ہے اور اسے میں اپنی دوست ردا اور ندا کے نام کرتی ہوں۔

یہ دوستی ہماری دوستی ہے ہماری پہچان
مل کر رہیں گے سنگ سنور جائے گا ہر کام

آمنہ نے بہت اچھی پرفارمنس دی اور اس کو پہلا انعام ملا جو اس نے اپنی دونوں دوستوں کے ساتھ مل کر لیا اور دونوں نے ردا کو سوری بھی کہا۔ آمنہ اور ندا نے اپنی اپنی ضد چھوڑ کر اپنی دوستی کا بھرم قائم رکھا۔

پیارے بچو! ہمیشہ اپنے دوستوں کی قدر کیجیے۔ بے وجہ کی ضد سے اپنی دوستی خراب مت کریں اور نہ اپنے دوستوں کو مصیبت میں ڈالے۔

ڈر

اصغر شمیم (کولکتہ، انڈیا)

وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ کئی سالوں سے اس کا یہ روز کا معمول تھا کہ آدھی رات کو وہ سنسان سڑک اور خالی اوور پل پر اپنی بائک کی رفتار کے ساتھ موت کا کھیل کھیلتا۔ ماں باپ لاکھ سمجھاتے مگر وہ نہیں سنتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ موت سے کیا ڈرنا، موت کا تو ایک دن متعین ہے۔ چھوٹا بھائی اکثر ساتھ جانے کی ضد کرتا تو وہ منع کر دیتا۔ آج اس کے چھوٹے بھائی کی دسویں سالگرہ تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ آج وہ منع نہ کر سکا۔ چھوٹے بھائی کو بائک پر بیٹھا کر اسی رفتار سے بائک چلا رہا تھا۔ جس رفتار سے وہ اکثر چلایا کرتا تھا۔ چھوٹے بھائی کو بھی بائک کی اس رفتار کے ساتھ کھیلنے میں مزہ آ رہا تھا۔ اس نے رفتار اور بڑھا دی کہ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور بائک اوور برج کے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔ چھوٹا بھائی جو بے فکری کے عالم میں بائک کے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا بائک کی تیز رفتاری کا مزہ لے رہا تھا، اچانک نیچے جا گرا۔ اور وہ خود بھی اور برج کے اوپر بائک سے بہت دور گرا۔ اسے معمولی چوٹ آئی۔ وہ اٹھا اور بے تحاشہ چھوٹے بھائی کی طرف دوڑا۔ موت نے تو اسے نہیں چکھا صرف ڈرا کر چھوڑ دیا۔ مگر موت کے اس کھیل میں موت اس کے چھوٹے بھائی کو چھوتے ہوئے گزر گئی۔

وہ شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور چھوٹے بھائی کو شدید زخمی دیکھ کر وہ پہلی بار ڈرا۔ بھائی کی تکلیف اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے پوری شدت سے اللہ سے دعا کی کہ بھائی کو کچھ نہ ہو۔ وہ آئندہ کبھی یہ گندہ کھیل نہیں کھیلے گا۔ اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ بروقت ہسپتال پہنچنے پر بھائی کی جان بچ گئی تھی۔ بھائی کی حالت دیکھ کر وہ ڈر گیا تھا۔ خطرناک کھیل کا انجام اچھا نہیں تھا۔ اس نے اللہ سے اور خود سے وعدہ کیا کہ یہ کھیل کبھی نہیں کھیلے گا۔ بلکہ جو لوگ یہ کھیل کھیلتے ہیں ان کو بھی روکے گا۔

آداب معاشرت

ہادیہ مختار

مس عائشہ اردو کی ٹیچر ہیں، بچوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ وہ بچوں کو نصاب کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت کے لیے اچھی اچھی باتیں بھی بتاتی ہے۔ اسی لیے ہفتہ وار بزم ادب میں انھوں نے اپنی جماعت کے بچوں کو بتایا کہ وہ آج حسن معاشرت پر بات کرنے والے ہیں۔ سب بچے ہمہ تن گوش تھے۔ جماعت کی مانیٹر ساجدہ نے سوال پوچھنے کے لیے ہاتھ کھڑا کیا تو مس نے اشارے سے اجازت دی۔

ساجدہ: ''مس حسن معاشرت سے کیا مراد ہے؟''

ٹیچر: ''انسان جس معاشرے میں رہتا ہے وہاں کے لوگوں سے اس کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس تعلق کو اچھے طریقے سے نبھانا حسن معاشرت ہے۔''

آمنہ: ''مس! حسن معاشرت کے سلسلہ میں اسلام نے ہمیں کیا ہدایت دی ہیں؟''

ٹیچر: ''بیٹا! اسلام ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ والدین، اساتذہ اور بزرگوں کا احترام کیا جائے۔ دوستوں کے ساتھ محبت اور مروت سے پیش آیا جائے۔ چھوٹوں پر شفقت کی جائے۔

ماریہ: ''مس! کیا قانون کا احترام کرنا بھی حسن معاشرت میں شامل ہے؟

ٹیچر: ''جی ہاں! قانون کا احترام کرنا بھی حسن معاشرت کا ایک پہلو ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر حال میں قانون کی پاسداری کریں اور ٹریفک کے قوانین کا احترام کریں۔''

مریم: ''مس! اسی طرح لوگوں کے حقوق کی ادائیگی بھی حسن معاشرت ہے۔ اسلام نے ہمیں یتیموں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔''

ٹیچر: شاباش مریم!

آپ نے صحیح کہا اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے ہمیں بیواؤں اور معذوروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم بھی دیا ہے۔

تحریم: ''مس! کیا اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنا

بھی حسن معاشرت ہے؟''

ٹیچر: ''جی ہاں! ہمیں اپنے ہم جماعتوں کی پڑھائی میں مدد کرنا چاہیے۔ انھیں مدد کی ضرورت ہو تو ان کی مدد کرنی چاہیے۔''

بقول شاعر

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ساجدہ: ''مس! آج آپ نے ہمیں بہت اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہم معاشرے کے مفید، ہمدرد، قانون کا احترام کرنے والے، وقت کے پابند اور بزرگوں کا احترام کرنے والے شہری بن سکیں۔''

ٹیچر: شاباش! اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسا کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

حوصلہ

بہرام علی وٹو

گرمی کا زور بہت دنوں بعد ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ بادل بارش کی نوید سنا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی تھی۔ بارش وقت کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی۔

چندو کے والدین بہت پریشان تھے کیونکہ چندو صبح اپنے سکول پڑھنے گیا تھا لیکن شام ہونے کو تھی پر چندو واپس نہ پہنچا تھا۔ بارش کی وجہ سے تمام گاؤں والے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ بارش کے ساتھ ژالہ باری بھی شروع ہو گئی تھی۔ شام کے بعد جب بارش رکی تو چندو کے والد نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ پورا گاؤں چھان مارا لیکن چندو کا کہیں نہ پتہ چل سکا۔

اب اس کے والدین کی فکر مزید بڑھ گئی۔ آخر کار وہ کہاں چلا گیا کیونکہ آج اس کا دوست علی بھی سکول نہیں گیا تھا۔ دوسرا سکول کی واپسی پر وہ راستہ بھی ایسا اختیار کر کے واپس آتا تھا جو بالکل سنسان تھا۔ آخر کار گاؤں والے چندو کے والد کے ساتھ مل کر اس سنسان راستے کی جانب چندو کو تلاش کرنے نکل پڑے کہ کہیں کوئی جنگلی جانور تو اسے نہیں کھا گیا یا زخمی کر گیا ہو کیونکہ ایسے واقعات بھی رونما ہو چکے تھے۔ گاؤں والے جب دریا کے اس بند پر پہنچے جو انہوں نے عارضی طور پر باندھا تھا تو انہیں چندو بند کا ایک سوراخ بھرتے نظر آیا کیونکہ بارش کی وجہ سے بند کی مٹی بہہ گئی تھی اور بند میں سوراخ ہو گیا تھا۔ چندو جب سکول سے واپس آ رہا تھا تو اس کی نظر بند پر پڑی جس سے بند کے چھوٹے سے سوراخ سے پانی نکل رہا تھا۔ چندو نے بیگ سائیڈ پر رکھ دیا اور مٹی سے اس سوراخ کو بھرنا شروع کر دیا۔ اب وہ جیسے بھر کر پیچھے ہٹتا پھر سوراخ سے مٹی ہٹ جاتی۔ وہ پھر کوشش کر کے مٹی بھر دیتا۔ اسی کوشش میں وہ شام تک بارش میں لگا رہا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور پرے سے گاؤں والے بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے پھر تسلی سے بند کا سوراخ بھر دیا لیکن چندو اگر اتنی ہمت اور حوصلہ نہ کرتا تو شاید پورا گاؤں ڈوب جاتا اور گاؤں والوں کی تمام فصلیں بھی تباہ ہو جاتیں۔ لیکن چندو نے ہمت کر کے پورے گاؤں کو تباہی سے بچا لیا تھا۔

☆......☆......☆

صاف رہو

مدیحہ غوری

اچھے بچّو پیارے بچّو
ننھے اور دلارے بچّو

ہاتھ بھی دھو لو، منہ بھی دھو لو
صاف رہو اور صاف بنو
روز نہا لو، کپڑے بدلو
صاف رہو اور صاف بنو

ناخن کاٹو اور دانت بھی مانجھو
صاف رہو اور صاف بنو
دیس بھی اپنا صاف رکھو تم
صاف رہو اور صاف بنو

ہے نبی ﷺ کا فرمان یہ ہی
صفائی نصف ایمان ہے! بچّو
صاف رہو اور صاف بنو

چٹخارے

حسن عمر

☆ ایک بچہ اپنی امّی کے پاس بھاگتا ہوا آیا اور پھولے سانسوں کے درمیان کہنے لگا:
''امّی، امّی! جلدی سے بیس روپے دے دیں۔ باہر فقیر کو دینے ہیں۔'' اس کی امّی نے گھر کے باہر جھانک کر دیکھا وہاں کوئی فقیر نظر نہ آیا، انہوں نے اس سے پوچھا:
''کہاں ہے فقیر؟''
''وہ گلی کے کونے میں کھڑا قلفیاں بیچ رہا ہے۔'' بچے نے معصومیت سے کہا۔

☆ ماں بیٹے کے کمرے میں جاکر اس کو جھنجوڑ کر جگاتے ہوئے کہنے لگیں:
''اعظم بیٹا! اٹھو اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔''
اعظم: ''امی میں سکول نہیں جاؤں گا، وہاں کوئی مجھے پسند نہیں کرتا، بچے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ سارے ٹیچرز میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اسکول کا سارا اسٹاف مجھے ناپسند کرتا ہے۔''
ماں (پریشان): ''لیکن بیٹا! اگر تم سکول نہیں جاؤ گے تو اسمبلی میں بچوں اور ٹیچرز سے خطاب کون کرے گا؟ تم اب ہیڈ ماسٹر ہو سکول کے۔''

☆ گڈو بچے سے (خوش ہو کر): ''میں نے سنا ہے کہ تم دوسرے بچوں سے یہ کہتے ہو کہ میں بہت ذہین اور عقلمند ہوں۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟''
بچہ (لاپرواہی سے): ''یار تمہیں تو پتہ ہے مجھے جھوٹ بولنے کی کتنی عادت ہے۔''

☆ کلاس میں دولڑکے شور مچا رہے تھے کہ ان کے ٹیچر آگئے۔ سزا کے طور پر ٹیچر نے دونوں کو اپنا پورا نام دو، دو سو بار لکھنے کو کہا۔ ایک لڑکا فوراً لکھنے لگا جب کہ دوسرا لڑکا رونے لگا۔ ٹیچر نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے روتے ہوئے کہا:
''سر اس کا نام ناصر علی ہے جب کہ میرا نام آغا غیاث الدین محمد اجمل ہے۔''

☆ ایک فقیر ایک گھر پر دستک دینے کے بعد عورت سے کہنے لگا:
''اگر آپ کے پاس کوئی پھٹا پرانا کوٹ ہے تو وہ مجھے دے دیں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' عورت نے اس فقیر کو دیکھا جو ایک مناسب حلیے کا اور اچھا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور کہنے لگی:
''تم نے خود جو کوٹ پہن رکھا ہے، وہ اتنا اچھا ہے تمہیں پھٹے پرانے کوٹ کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''
فقیر نے بے چارگی سے کہا: ''آپ کی بات ٹھیک ہے بی بی۔ لیکن اس نئے کوٹ کی وجہ سے میرا سارا دھندا چوپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔''

☆ ایک صاحب گہری نیند سو رہے تھے کہ آدھی رات کو اچانک ان کے موبائل پر کال آنے لگی۔ جب انہوں نے کال اٹھائی تو دوسری طرف ان کا ہمسایہ تھا جو ان سے کہنے لگا: ''آپ کو جو تکلیف ہوئی اس کے لئے معافی چاہتا ہوں، بات یہ ہے کہ میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں اور آپ کا کتا ساری رات بھونکتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آتی۔ برائے مہربانی اس کا کچھ علاج کیجئے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اگلی رات اسی وقت ان صاحب نے اپنے پڑوسی کو کال ملائی اور کہا: ''آپ کو جو تکلیف ہوئی اس کے لئے معذرت، لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کتا میرا نہیں ہے۔''

☆ ایک صاحب بہت غصے سے چلا رہے تھے:
''آج میں اپنے کتے کو نہیں چھوڑوں گا!'' کسی نے پوچھا:
''بھائی اس بیچارے کا کیا قصور ہے؟'' وہ صاحب تنگ کر کہنے لگے: ''قصور پوچھتے ہیں آپ؟ میں نے ایک مرغی پالی تو اس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، طوطا پالا تو اس کو نوچ کر زخمی کر دیا، ایک خرگوش لے کر آیا تو اس کو بھگا دیا۔ اب میرا ایک دوست پندرہ دن سے میرے گھر میں رکا ہوا ہے اور یہ اس کو کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔''

☆ ایک شخص چوری کے الزام میں گرفتار ہوا۔ عدالت میں پیشی کے دوران اس نے جج سے کہا: ''جج صاحب! میں اس بھری دنیا میں اکیلا ہوں، میرے پاس کھانے کو روٹی نہیں، رہنے کو مکان نہیں بہت عرصے سے بے روزگار ہوں اور میرا کوئی دوست بھی نہیں ہے۔'' جج نے اس کی بات سن کر کہا:
''تمہاری کہانی واقعی بہت دکھ بھری ہے۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ بھیج رہا ہوں جہاں تمہیں رہنے کی جگہ، دو وقت کا کھانا اور دوست بنانے کا موقع ملے گا اور یہ سب کچھ تمہیں سرکار کی طرف سے دیا جائے گا، تمہارا ایک روپیہ خرچ نہیں ہوگا۔'' وہ آدمی خوش ہو کر کہنے لگا: ''ایسی کون سی جگہ ہے بھلا؟'' جج نے کہا: ''سینٹرل جیل۔''

☆ ایک شخص کسی کے گھر مہمان کے طور پر رکنے گیا۔ اس کو روز کھانے میں دال ملتی۔ وہ بے چارہ دال کھا کھا کر تنگ آ گیا تھا۔ ایک دن حسب معمول دال کھا رہا تھا کہ میزبان نے پوچھا: ''آج چاند کی کون سے تاریخ ہے؟'' مہمان نے جل کر جواب دیا: ''چاند کی تو نہیں پتہ البتہ آج دال کی بیس تاریخ ہے!''

قارئین کے کھٹے میٹھے اور دلچسپ خطوط والا منفرد سلسلہ!

السلام علیکم!

الف نگر کا خوبصورت مزاح نمبر موصول ہوا۔ میری کہانی اتنے خوبصورت اسکیچ کے ساتھ شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ تھوڑا اخس لیس کہانی پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ یہ اس مہینے کی بہترین کہانی رہی۔ چھوٹی بی کے کارنامے ایک اور بہترین اور مزاحیہ کہانی رہی پڑھ کر مزہ آیا۔ بنگلہ نمبر 407 بہت زبردست کہانی رہی۔ میٹھے سیب پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور اچھا سبق بھی ملا۔ مجموعی طور پر پورا رسالہ بہترین اور آپ کی منہ بولتی محنت کا ثبوت ہے۔

سیدہ اقرا اعجاز (لطیف آباد حیدرآباد سندھ)

☆ وعلیکم السلام۔ تبصرے کے لیے شکریہ۔

پیاری آپی عائشہ اطہر!

السلام علیکم!

میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں اور الف نگر بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ مجھے مزاح نمبر کی بہت سی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ بھوت سے ملاقات، تھوڑا اخس لیس، چھوٹی بی کے کارنامے، باجی جن، میٹھے سیب، آنٹی توڑ پھوڑ اور خاص طور پر "رمضو چاچا کا رمضان" میری دادی اماں بھی رمضو چاچا کی طرح اونچا سنتی ہیں۔ ہم بھی ان کو بہت جلد وہ آلہ لے کر دیں گے جو بچوں نے کہانی میں ان کو لے کر دیا۔

آپی میں نے ایک کہانی لکھی ہے۔ کیا وہ الف نگر میں چھپے گی؟ ہم سب گھر والوں کی طرف سے آپ سب کو سلام۔

عبداللہ احسن (لاہور)

☆ پیارے بیٹے! آپ کہانی لکھ کر ضرور بھیجیں۔ قابل اشاعت ہوئی تو ضرور لگے گی ان شاء اللہ

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ!

اس دفعہ الف نگر کے شمارے کا انتظار ہمیشہ سے کہیں زیادہ تھا کیونکہ اس بار کا میگزین مزاح نمبر قرار پایا تھا۔ آخر کار میگزین ہاتھ میں آ ہی گیا اور سارے کام سرعت سے نمٹانے کے بعد چائے کی گرما گرم پیالی اور بسکٹ کی بڑی سی پلیٹ کے ساتھ شمارے کا مطالعہ کرنے لگی اور بچوں کو بھی ساتھ بٹھا لیا تاکہ وہ بھی کہانیوں کا بھرپور مزا لے سکیں۔ میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے سب سے پہلے چھوٹی بی کے کارنامے پر نظر پڑی۔

عنوان ہی ایسا تھا کہ بس دلچسپی سے پڑھتی چلی گئی اور لبوں پر رینگتی مسکراہٹ کب قہقہے میں بدل گئی پتہ ہی نہ چلا۔ محترمہ ریحانہ اعجاز صاحبہ نے خوب لکھا۔ کہانی بھوت سے ملاقات بڑی ہی تجسس بھری ثابت ہوئی۔ آخر میں بھوت کا راز کھلا تو جان میں جان آئی۔ اس کہانی میں دونوں کزنز کے مابین جو مکالمات تھے ان کی بے ساختگی کمال تھی۔

کہانی رمضو چاچا کا رمضان اپنی مثال آپ تھی۔ دادی کا عزیز از جان مرغا حلال ہو گیا اور قورمے کا روپ دھارن کر کے دادی جان کے سامنے تھا۔ ساری کہانی میں جہاں رمضو چاچا ہنساتے رہے وہیں ان پر رحم بھی آتا رہا کہ سماعت کتنی بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس سے کبھی محروم نہ کرے۔ لیکن کہانی کے اختتام میں بچوں کا رمضو چاچا کو کان کا آلہ تحفے میں دینا دل خوش کر گیا۔ عائشہ اطہر کی یہ کہانی بڑی مہارت سے ایک بہترین سبق نونہالوں تک پہنچا گئی۔ مبارک باد قبول کیجیے۔

کہانی خوشی کی خوشی ایک گہرا موضوع ثابت ہوئی۔ واقعی آزادی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ تھوڑا سا اخس لیس نے تھوڑا نہیں بلکہ بہت ہنسایا۔ اگر ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو ایسی بے پناہ مثالیں نظر آتی ہیں جو اپنی معصوم غلطیوں کی وجہ سے نت نئے لطیفے میں بدل جاتی ہیں۔

دادا جان کی بیٹھک میں روزہ کی افادیت پر خوب روشنی ڈالی گئی جو کہ آئندہ آنے والے ماہ مبارک کے لئے بہترین انتخاب رہی ہے۔

سوا سیر میں ڈھول صاحب نے جتنا سیر ہو کر کھانا کھایا تھا تو پیٹ میں درد تو ہونا ہی تھا۔ ان کے پیچھے کتا لگا کر میزبان نے خوب بدلہ لیا ہے۔ یہ کہانی بھی اپنے اندر ہنسی کا طوفان سمیٹے ہوئے تھی۔ خوشیوں کا ڈبہ پڑھ کر احساس ہوا کہ ہر گھر میں ایک ایسا ڈبہ ضرور ہونا چاہیے۔

اول جلول کہانی کے کرداروں کی حرکات بھی اول جلول ہی ثابت ہوئیں۔ چار جلیبی کے ساتھ ایک جلیبی مفت تو سنا تھا لیکن ایک جلیبی کے ساتھ چار جلیبی مفت پڑھ کر قہقہہ ضبط نہ ہو سکا۔ شاندار کہانی!

اڑن طشتری کا تجربہ مکمل پڑھنے کے لیے پورا میگزین کھنگال ڈالا اور مایوسی کا سامنا کرنے کے بعد جب دوبارہ کہانی کے پہلے صفحے کو دیکھا تو انکشاف ہوا کہ یہ تو پہلی قسط ہے۔ دوسری قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔

بنگلہ نمبر چار سو سات پڑھتے ہوئے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ احمد شیر خان صاحب نے کہانی کی بنت ہی ایسی کی کہ قاری خود کو کہانی کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

مینار پاکستان معلومات کا خزانہ ثابت ہوئی اور رخشندہ بیگ کی نظم وطن تجھ پہ قربان نے دل موہ لیا۔ باقی ساری کہانیاں اور سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح جاندار رہے۔

اتنا خوبصورت، رنگا رنگ اور دلچسپ رسالہ نکالنے پر ادارے کو بہت بہت داد اور مبارکباد۔

فرزین لہرا (کراچی)

☆ اتنے بھرپور تبصرے کے لیے بے حد مشکور ہیں۔

الف کتاب پبلی کیشنز کی بچوں کے لیے خوبصورت رنگین کتابیں!

آرڈر کے لیے رابطہ کریں! 0321 8460220

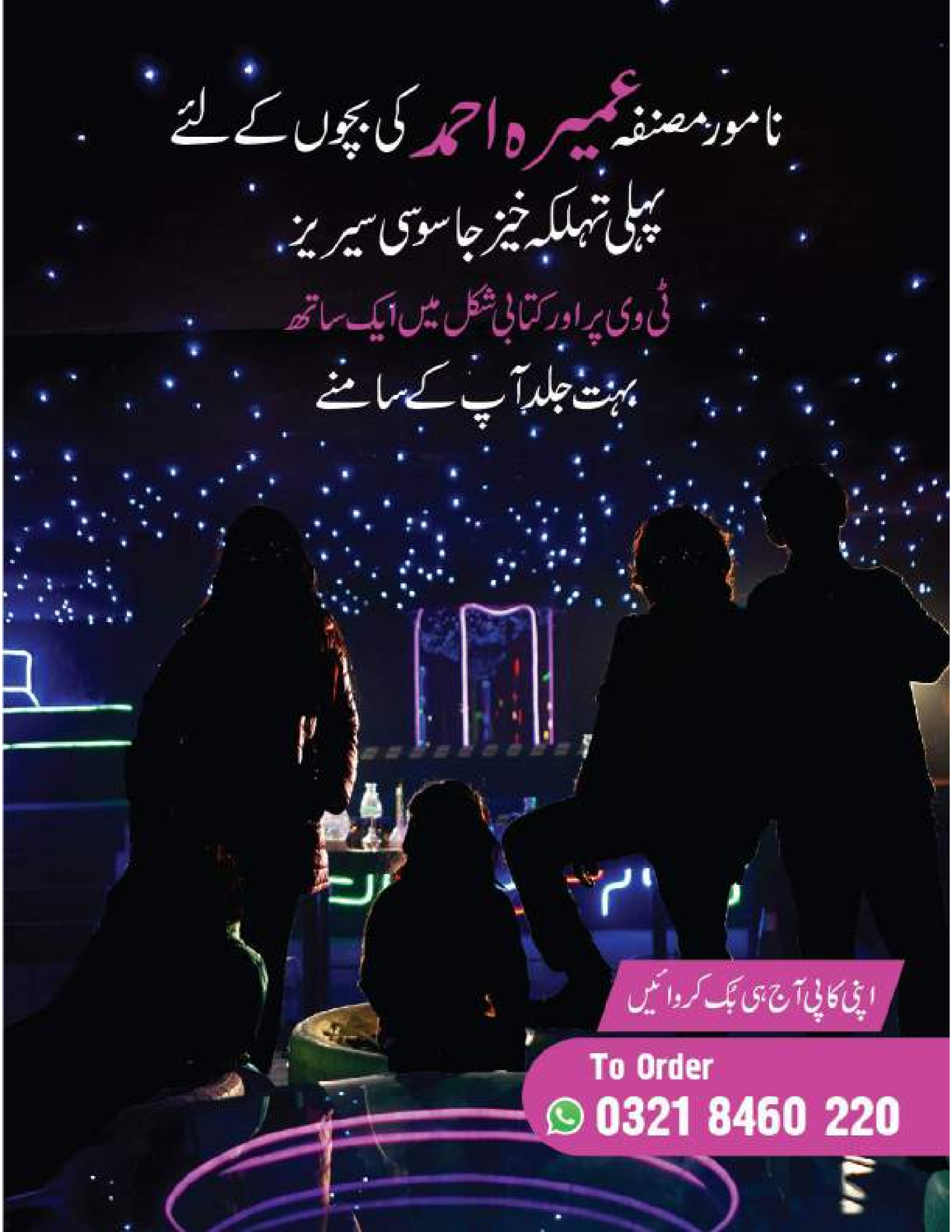

نامور مصنفہ عمیرہ احمد کی بچوں کے لئے
پہلی تہلکہ خیز جاسوسی سیریز
ٹی وی پر اور کتابی شکل میں ایک ساتھ
بہت جلد آپ کے سامنے
اپنی کاپی آج ہی بک کروائیں
To Order
0321 8460 220